کشمیر:
نعروں سے حقیقت تک

تاریخ، سیاست، آئین اور شناخت
کا ایک تنقیدی مطالعہ



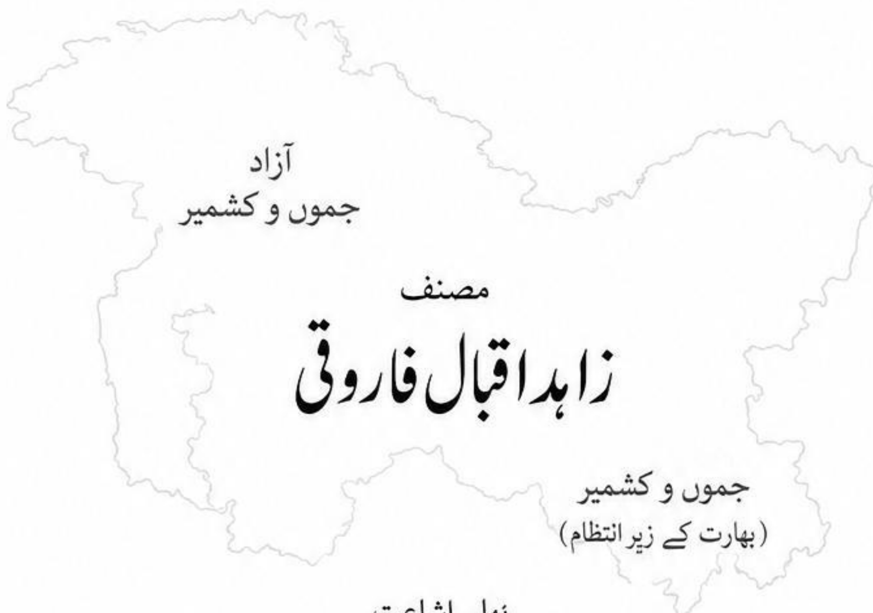
زاہد اقبال فاروقی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کشمیر:

نعروں سے حقیقت تک

تاریخ، سیاست، آئین اور شناخت
کا ایک تنقیدی مطالعہ



مصنف

زاہد اقبال فاروقی

پهلی اشاعت
2026ء

یہ کتاب والد گرامی

محمد اقبال فاروقی رحمۃ اللہ

(1941 – 2012ء)

کی علمی و فکری خدمات کے نام

حقِ اشاعت

کشمیر: نعروں سے حقیقت تک

تاریخ، سیاست، آئین اور شناخت کا ایک تنقیدی مطالعہ

مصنف: زاہد اقبال فاروقی

ناشر: زاہد اقبال فاروقی

پہلا ایڈیشن: 2026ء

وضاحت

یہ کتاب کسی ایک سیاسی جماعت، نظریے یا شخصیت کی تائید یا تردید کے لیے نہیں لکھی گئی، بلکہ دستیاب تاریخی شواہد، آئینی دستاویزات، معتبر تحقیقی ماخذ اور مصنف کے تجزیاتی مطالعے کی بنیاد پر مرتب کی گئی ہے۔ جہاں مختلف آراء موجود ہیں، وہاں حتی الامکان متوازن اور استدلالی انداز اختیار کیا گیا ہے تاکہ قاری خود شواہد کی روشنی میں اپنی رائے قائم کر سکے۔

اشاعتی معلومات

عنوان:	کشمیر: نعروں سے حقیقت تک
ذیلی عنوان:	تاریخ، سیاست، آئین اور شناخت کا ایک تنقیدی مطالعہ
مصنف:	زاہد اقبال فاروقی
ناشر:	زاہد اقبال فاروقی
پہلا ایڈیشن:	2026ء
ملکِ اشاعت:	پاکستان

رابطہ

موبائل: 00966559154307

واٹس ایپ: 00923005513597

ای میل: zifarooqi@gmail.com

فیس بک: www.facebook.com/zifarooqi75

نوٹ: قرآن مجید کی آیات کے تراجم حسب ضرورت مختلف مستند تراجم سے استفادہ کرتے ہوئے نقل کیے گئے ہیں، جبکہ احادیث، تاریخی واقعات اور دیگر علمی اقتباسات حتی الامکان اصل ماخذ کے حوالے سے پیش کیے گئے ہیں۔

انتساب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ کتاب

اپنے والدِ گرامی

محمد اقبال فاروقی مرحوم (25 جون 1941ء — 25 جولائی 2012ء)

کے نام منسوب کرتا ہوں؛

جو پیشے کے اعتبار سے ایک ماہرِ تعلیم، ذوق کے اعتبار سے محقق و مصنف، اور کردار کے اعتبار سے اصول پسند، دیانت دار اور علم دوست انسان تھے۔

انہوں نے اپنی پوری زندگی علم کو ذریعۂ معاش نہیں بلکہ ذریعۂ اصلاح سمجھا۔ تدریس کو محض ملازمت نہیں بلکہ ایک امانت جانا، اور تحقیق کو شہرت کا وسیلہ نہیں بلکہ حق کی تلاش کا فریضہ سمجھ کر نبھایا۔ ان کے نزدیک قلم کی حرمت اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک وہ تعصب، مصلحت اور خواہشِ نفس سے آزاد رہ کر سچائی کی گواہی دیتا رہے۔

علمی و تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ انہوں نے ملی و سماجی میدان میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ وہ تنظیمِ اساتذہ آزاد کشمیر کے بانی سیکرٹری جنرل، جماعتِ اسلامی آزاد کشمیر کی جنرل کونسل کے رکن اور تراڑکھل کے سابق امیر جماعتِ اسلامی رہے۔ ان کے نزدیک دعوت، تعلیم اور اصلاحِ معاشرہ ایک دوسرے سے جدا نہیں بلکہ ایک ہی مقصد کے مختلف پہلو تھے، اور وہ یقین رکھتے تھے کہ پائیدار معاشرتی تبدیلی علم، کردار اور اصولی جدوجہد کے امتزاج سے ہی ممکن ہے۔

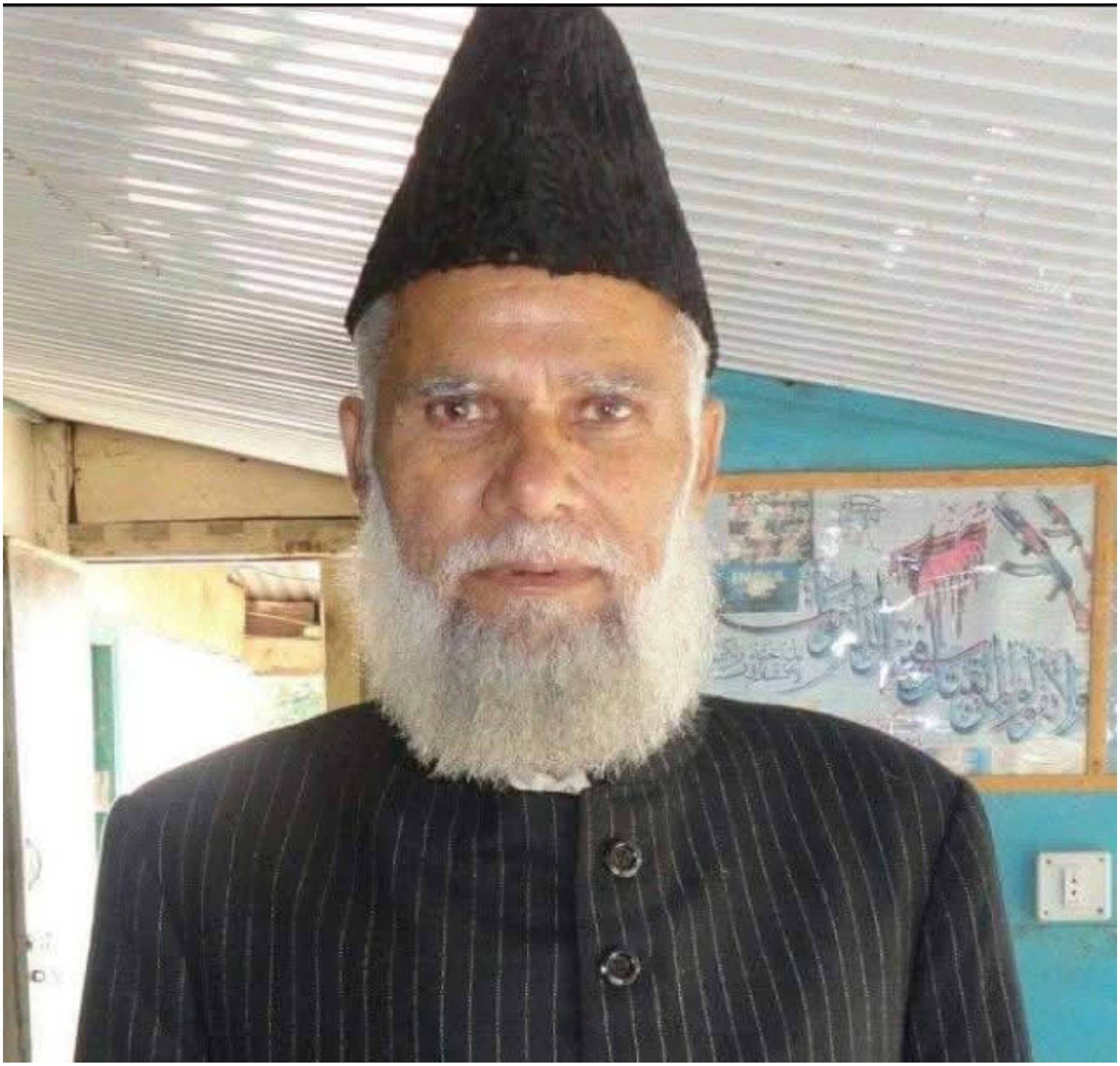
اگر اس کتاب میں کہیں دلیل کو جذبات پر، اصول کو مصلحت پر، اور تحقیق کو تقلید پر ترجیح دینے کی کوشش نظر آتی ہے، تو اس میں میرے والد کی علمی تربیت اور فکری وراثت کا نمایاں حصہ ہے۔ انہوں نے مجھے یہ سبق دیا کہ اختلاف، اگر علم اور اخلاق کے دائرے میں ہو، تو معاشروں کی فکری نشوونما کا ذریعہ بنتا ہے؛ اور تحقیق، اگر دیانت کے ساتھ کی جائے، تو وہ انسان کو اشخاص کی نہیں بلکہ حقائق کی پیروی کرنا سکھاتی ہے۔

میں اس کتاب کو ان کے لیے کسی خراجِ تحسین سے زیادہ ایک ادنیٰ سی علمی نسبت سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی خدمات کو شرفِ قبول عطا فرمائے، ان کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند کرے، اور ان کے علم و عمل کو ان کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے۔

﴿رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا﴾

"اے میرے رب! ان پر رحم فرما، جس طرح انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی۔"
(سورة الإسراء: 24)

زاہد اقبال فاروقی



محمد اقبال فاروقیؒ

حیات و خدمات

محمد اقبال فاروقیؒ)25 جون 1941ء – 25 جولائی 2012ء (آزاد جموں و کشمیر کی ان علمی، تعلیمی اور دعوتی شخصیات میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی علم، تحقیق، تعلیم اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے وقف کیے رکھی۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ایک ممتاز ماہرِ تعلیم، ذوق کے اعتبار سے محقق و مصنف، اور کردار کے اعتبار سے ایک اصول پسند دیانت دار اور علم دوست شخصیت تھے۔ ان کی زندگی اس حقیقت کی روشن مثال تھی کہ علم اگر اخلاص، کردار اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ وابستہ ہو تو وہ معاشرے کی فکری تعمیر کا مؤثر ذریعہ بن جاتا ہے۔

آپ کی پیدائش 25 جون 1941ء کو قاضیان، کوپرہ، شاہدرہ شریف، ضلع راجوری، ریاست جموں و کشمیر میں ہوئی۔ تقسیمِ ہند اور ریاست جموں و کشمیر کے الم ناک حالات نے آپ کی نسل کو بھی ہجرت، جدائی اور نئے حالات میں زندگی کی ازسرِ نو تعمیر جیسے کٹھن مراحل سے گزارا۔ یہی تجربات بعد کی زندگی میں آپ کی فکری پختگی، قومی شعور اور اصول پسندی کا حصہ بن گئے۔ 25 جولائی 2012ء کو آپ اس دنیا سے رخصت ہوئے اور تراڑکھل، آزاد جموں و کشمیر میں آسودۂ خاک ہیں۔

ابتدائی تعلیم کے بعد آپ نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور بی اے)آنرز(، ایم اے اور بی ایڈ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ محکمۂ تعلیم سے وابستہ ہو کر طویل عرصہ تدریسی خدمات انجام دیں اور 1996ء میں سینئر مدرس کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ آپ کے نزدیک تدریس صرف ایک پیشہ نہیں بلکہ ایک مقدس امانت تھی۔ آپ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ایک استاد صرف نصاب نہیں پڑھاتا بلکہ قوموں کا فکری و اخلاقی مستقبل تشکیل دیتا ہے۔ اسی لیے آپ نے ہمیشہ اپنے شاگردوں میں علم کے ساتھ کردار، دیانت اور احساسِ ذمہ داری پیدا کرنے کی کوشش کی۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ تحقیق، مطالعہ اور تصنیف بھی آپ کی شخصیت کا نمایاں وصف تھا۔ آپ تاریخی، دینی، سماجی اور فکری موضوعات پر گہری نظر رکھتے تھے اور ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ کسی بھی مسئلے کو جذبات، تعصب یا تقلید کے بجائے تحقیق، دلیل اور مستند شواہد کی بنیاد پر سمجھا جانا چاہیے۔ آپ کے نزدیک قلم کی اصل حرمت اسی وقت برقرار رہتی ہے جب وہ حق کی گواہی دے اور انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھے۔

آپ نے صرف تعلیمی میدان ہی میں نہیں بلکہ تنظیمی، سماجی اور دعوتی شعبوں میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ آپ تنظیمِ اساتذہ آزاد کشمیر کے بانی سیکرٹری جنرل رہے اور اساتذہ میں علمی، اخلاقی اور پیشہ ورانہ شعور بیدار کرنے کے لیے بھرپور کردار ادا کیا۔ آپ کی تنظیمی بصیرت، اعتدال پسند مزاج اور اصولی قیادت نے آپ کو اہلِ علم اور اساتذہ کے حلقوں میں ایک قابلِ احترام مقام عطا کیا۔

اسی طرح آپ جماعتِ اسلامی آزاد جموں و کشمیر کی جنرل کونسل کے رکن رہے اور تراڑکھل کے سابق امیر جماعتِ اسلامی کی حیثیت سے بھی دینی، سماجی اور تنظیمی ذمہ داریاں ادا کیں۔ تاہم آپ کے نزدیک سیاست کا مفہوم اقتدار کا حصول نہیں بلکہ اصولوں کی پاسداری، دعوتِ دین، اصلاحِ معاشرہ اور عوامی خدمت تھا۔ آپ ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ اختلافِ رائے کو اخلاق، عدل اور علمی دیانت کے دائرے میں رہنا چاہیے، کیونکہ پائیدار معاشرتی تبدیلی نفرت سے نہیں بلکہ علم، کردار اور حکمت سے آتی ہے۔

آپ کی شخصیت میں علم و عمل کا حسین امتزاج نمایاں تھا۔ سادگی، تقویٰ، دیانت، تحمل، خوش اخلاقی، وسیع المطالعگی اور اصولوں پر ثابت قدمی آپ کی نمایاں صفات تھیں۔ آپ نے کبھی شہرت یا منصب کو اپنی زندگی کا مقصد نہیں بنایا بلکہ خاموشی، اخلاص اور ذمہ داری کے ساتھ اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ اسی وجہ سے آپ کے شاگرد، رفقائے کار اور اہلِ علاقہ آج بھی آپ کو احترام اور محبت سے یاد کرتے ہیں۔

راقم کے لیے آپ صرف والد نہیں بلکہ پہلے معلم اور فکری رہنما بھی تھے۔ دلیل کو جذبات پر، اصول کو مصلحت پر، اور تحقیق کو تقلید پر ترجیح دینے کا جو ذوق اس کتاب میں نمایاں ہے، وہ بڑی حد تک آپ ہی کی علمی تربیت اور فکری وراثت کا ثمر ہے۔ اگر یہ کتاب قاری کو جذبات کے بجائے دلیل، تعصب کے بجائے انصاف اور روایت کے بجائے تحقیق کی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوتی ہے تو اس میں میرے والد کی تربیت کا حصہ یقیناً شامل ہے۔

یہ مختصر تعارف ان کی پوری زندگی اور خدمات کا مکمل احاطہ نہیں کر سکتا، لیکن ان کی علمی، تعلیمی، دعوتی اور سماجی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش ضرور ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے، ان کی قبر کو نور سے بھر دے، اور ان کے علم، تدریس، دعوت اور اخلاص کو ان کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے۔

آمین۔

مختصر کوائف

نام :محمد اقبال فاروقیؒ

تاریخِ پیدائش :25 جون 1941ء

مقامِ پیدائش :قاضیان، کوپرہ، شاہدرہ شریف، ضلع راجوری، ریاست جموں و کشمیر

تعلیم :بی اے)آنرز(، ایم اے، بی ایڈ

پیشہ :ماہر تعلیم، محقق، مصنف، سینئر مدرس

سالِ ریٹائرمنٹ :1996ء

تنظیمی خدمات :بانی سیکرٹری جنرل، تنظیمِ اساتذہ آزاد کشمیر

دینی و سماجی خدمات :رکن جنرل کونسل، جماعتِ اسلامی آزاد جموں و کشمیر؛ سابق امیر، جماعتِ اسلامی تراڑکھل

تاریخِ وفات :25 جولائی 2012ء

مدفن :تراڑکھل، آزاد جموں و کشمیر

پیش لفظ

ہر دور اپنے ساتھ کچھ ایسے سوالات لے کر آتا ہے جن سے صرف سیاست نہیں، بلکہ قوموں کی فکری سمت بھی متعین ہوتی ہے۔ گزشتہ ماہ آزاد جموں و کشمیر میں پیدا ہونے والی سیاسی، آئینی اور سماجی صورتِ حال بھی ایسے ہی سوالات کو جنم دینے کا باعث بنی۔ ان واقعات نے ریاست، آئین، عوامی نمائندگی، مہاجر نشستوں، ریاستی اداروں، جمہوری ارتقا اور کشمیر کے تاریخی و فکری بیانیے پر ایک نئی بحث کو جنم دیا۔ انہی حالات کے تناظر میں اس کتاب میں شامل بیشتر مضامین قلم بند کیے گئے۔

یہ تمام تحریریں ابتدا میں سوشل میڈیا پر الگ الگ مواقع پر شائع ہوئیں۔ ان کا مقصد وقتی سیاسی بحث میں شریک ہونا نہیں تھا، بلکہ روزمرہ کے شور و غوغا سے ہٹ کر ان اصولی اور تاریخی سوالات کی طرف توجہ دلانا تھا جو اکثر وقتی جذبات کے زیرِ اثر پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ قارئین کی حوصلہ افزائی، علمی مکالمے اور مثبت تنقید نے یہ احساس پیدا کیا کہ ان منتشر تحریروں کو ایک منظم کتابی صورت میں محفوظ کیا جانا چاہیے تاکہ وہ وقتی حالات سے آگے بڑھ کر ایک مستقل فکری دستاویز کی حیثیت اختیار کر سکیں۔

کتابی اشاعت کے لیے ان مضامین کو تقریباً اسی شکل میں پیش کیا گیا ہے جس صورت میں وہ پہلی بار شائع ہوئے تھے۔ صرف ایک مضمون میں موضوع کی تکمیل، تسلسل اور کتابی اسلوب کے تقاضوں کے مطابق محدود تدوین و ترمیم کی گئی ہے، جبکہ باقی تمام تحریریں من و عن اپنی اصل صورت میں شامل کی گئی ہیں، تاکہ ان کی زمانی ترتیب، فکری فضا اور اصل اسلوب محفوظ رہ سکے۔

اگرچہ ان مضامین کی فوری محرک حالیہ حالات تھے، لیکن ان میں زیرِ بحث سوالات محض ایک مخصوص وقت یا واقعے تک محدود نہیں۔ ریاست، آئین، تاریخ، جمہوریت، عدل، نمائندگی، سیاسی شعور اور اجتماعی ذمہ داری جیسے موضوعات ہر دور میں اپنی اہمیت برقرار رکھتے ہیں۔ اسی لیے اس مجموعے کو محض حالاتِ حاضرہ کا ردِعمل نہیں، بلکہ ان بنیادی اصولوں پر ایک فکری مکالمہ سمجھنا چاہیے جن پر کسی بھی مہذب اور منصفانہ سیاسی نظام کی بنیاد استوار ہوتی ہے۔

یہ کتاب کسی حتمی فیصلے کا دعویٰ نہیں کرتی، بلکہ سوال اٹھانے، تحقیق کی دعوت دینے اور دلیل کی بنیاد پر مکالمے کو فروغ دینے کی ایک ادنیٰ سی کوشش ہے۔ اگر یہ کاوش قاری کو جذباتی نعروں سے آگے بڑھ کر تاریخ، آئین، اصول اور حقائق کی روشنی میں غور و فکر کرنے پر آمادہ کر سکے، تو یہی اس کتاب کی اشاعت کا اصل مقصد اور مصنف کے لیے سب سے بڑی کامیابی ہوگی۔

زاہد اقبال فاروقی

مصنف کا نوٹ

کشمیر کا سوال: جذبات سے آگے، اصول اور حقیقت کی روشنی میں

تاریخ کے بڑے مسائل صرف نعروں سے نہیں سمجھے جا سکتے۔ نعرے قوموں کے جذبات کی ترجمانی ضرور کرتے ہیں، لیکن کسی مسئلے کی حقیقت جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ان نعروں کے پیچھے موجود تصورات، حالات، محرکات اور نتائج کا جائزہ لیا جائے۔

کشمیر کا مسئلہ بھی ایسا ہی ایک مسئلہ ہے۔ یہ صرف زمین کا تنازع نہیں، بلکہ انسانوں، شناختوں، سیاسی تصورات، تاریخی تجربات اور مستقبل کے امکانات کا سوال ہے۔ اس لیے اس پر گفتگو کرتے وقت نہ جذباتی وابستگی کافی ہے اور نہ محض سیاسی دعوے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ حقائق کو دیانت داری کے ساتھ دیکھا جائے اور ہر معاملے کو عدل کے اصول پر پرکھا جائے۔

میرا اپنا خاندان بھی ان لاکھوں کشمیری خاندانوں میں شامل ہے جنہوں نے 1947ء کے ہنگامہ خیز دور میں جموں و کشمیر سے ہجرت کی۔ ہجرت صرف مکان چھوڑنے کا نام نہیں ہوتی، یہ یادوں، رشتوں اور ایک پورے ماضی کے بچھڑنے کا نام ہے۔ اس تجربے کا ایک جذباتی پہلو ضرور ہے، لیکن یہی تجربہ اس بات کا تقاضا بھی کرتا ہے کہ کشمیر جیسے مسئلے کو محض جذبات کے بجائے انصاف، تحقیق اور اصول کی بنیاد پر سمجھا جائے۔

اس کتاب کا مقصد کسی ایک جماعت، فرد یا سیاسی بیانیے کو حق پر ثابت کرنا نہیں، بلکہ یہ سمجھنے کی کوشش کرنا ہے کہ کشمیر کی سیاست کن افکار، نعروں اور تاریخی عوامل سے تشکیل پاتی رہی۔ "کشمیر بنے گا پاکستان"، "کشمیر بنے گا خودمختار" اور "کشمیر بنے گا دارالسلام" جیسے تصورات دراصل تین مختلف سوالات کی نمائندگی کرتے ہیں: سیاسی وابستگی کا سوال، قومی خوداختیاری کا سوال، اور اس نظامِ زندگی کا سوال جو کسی بھی مستقبل کی ریاست کی بنیاد بننا چاہیے۔

ایک سنجیدہ مطالعہ یہ تقاضا کرتا ہے کہ ہم اپنے پسندیدہ تصورات کے ساتھ ساتھ ان سوالات کا بھی سامنا کریں جو ہمارے لیے مشکل ہوں۔ کیونکہ حق وہ نہیں جو صرف ہماری خواہش کے مطابق ہو، بلکہ حق وہ ہے جو دلیل، انصاف اور حقیقت کے معیار پر پورا اترے۔

قرآن مجید نے عدل کو انسانی معاملات کی بنیادی قدر قرار دیا ہے:

"اے ایمان والو! انصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنو، خواہ وہ خود تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔"

(النساء: 135)

یہی اصول تاریخ کے مطالعے میں بھی رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اگر ہم اپنی پسندیدہ جماعت، نظریے یا ادارے کی غلطی کو نظر انداز کرتے ہیں اور مخالف کی کمزوری کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں تو ہم دراصل تاریخ کے ساتھ انصاف نہیں کر رہے ہوتے۔

اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ کشمیر کے سوال کو اسی زاویے سے دیکھا جائے۔ یہاں نعروں کا تجزیہ ہے، مگر نعروں کی پرستش نہیں؛ تاریخ کا مطالعہ ہے، مگر تاریخ کو اپنے سیاسی مفادات کے لیے استعمال کرنے کی کوشش نہیں؛ نظریات پر گفتگو ہے، مگر اختلاف کو دشمنی میں تبدیل کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔

ریاستیں صرف طاقت سے قائم نہیں رہتیں۔ ان کی مضبوطی انصاف، قانون، اخلاقی اعتماد اور عوامی رضامندی سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح تحریکیں بھی صرف جذبات سے کامیاب نہیں ہوتیں، بلکہ ان کے لیے واضح فکر، درست حکمتِ عملی اور صالح کردار ضروری ہوتا ہے۔

کشمیر کا مستقبل بھی اسی اصول سے وابستہ ہے۔ سوال صرف یہ نہیں کہ کون سا نعرہ زیادہ بلند تھا، بلکہ یہ ہے کہ کون سا تصور انسان کے لیے زیادہ عدل، امن، عزت اور ذمہ داری کا راستہ فراہم کرتا ہے۔

یہ کتاب کسی آخری فیصلے کا دعویٰ نہیں کرتی۔ یہ ایک فکری کوشش ہے کہ کشمیر کے پیچیدہ مسئلے کو نعروں کے شور سے نکال کر تاریخ، دلیل اور اصول کی روشنی میں سمجھا جائے۔

کیونکہ قومیں صرف اپنے ماضی پر فخر کرنے سے نہیں بنتیں، بلکہ اپنے ماضی کا بے لاگ جائزہ لے کر مستقبل کی بہتر تعمیر کرنے سے بنتی ہیں۔

زاہد اقبال فاروقی

دیباچہ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيدنا محمد، خاتم النبيين، وعلى آله وصحبه أجمعين۔

کشمیر برصغیر کا محض ایک جغرافیائی خطہ نہیں، بلکہ ایک ایسا تاریخی، سیاسی اور تہذیبی مسئلہ ہے جس نے گزشتہ سات دہائیوں سے جنوبی ایشیا کی سیاست، عالمی سفارت کاری اور کروڑوں انسانوں کی اجتماعی زندگی کو متاثر کیا ہے۔ اس مسئلے پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں، قراردادیں منظور ہوئیں، جنگیں لڑی گئیں، مذاکرات ہوئے، تحریکیں اٹھیں اور نسلیں گزر گئیں، مگر اس کے باوجود آج بھی یہ سوال اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہے کہ آخر ہم نے اس مسئلے کو سمجھنے کی کوشش زیادہ کی ہے یا صرف اس پر اپنے اپنے مؤقف کو دہراتے رہے ہیں؟

بدقسمتی سے کشمیر کے بارے میں ہماری بیشتر گفتگو دو انتہاؤں کے درمیان گھومتی رہی ہے۔ ایک طرف ایسا جذباتی بیانیہ ہے جو تاریخ کو صرف نعروں میں سمو دینا چاہتا ہے، اور دوسری طرف ایسا خشک سیاسی تجزیہ ہے جو انسان، نظریے، اخلاق اور تاریخ کے باہمی تعلق کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جذبات تحقیق پر غالب آ جاتے ہیں اور وابستگیاں دیانت پر۔

زیر نظر کتاب انہی دو انتہاؤں کے درمیان ایک متوازن راستہ تلاش کرنے کی ایک ادنیٰ کوشش ہے۔ اس کا مقصد کسی جماعت، شخصیت یا ادارے کے حق یا مخالفت میں فیصلہ سنانا نہیں، بلکہ ان سوالات کو علمی انداز میں سامنے لانا ہے جنہیں عموماً نعروں کے شور میں سننے کی فرصت نہیں ملتی۔

اس کتاب میں بار بار ایک بنیادی اصول اختیار کیا گیا ہے کہ تاریخ کو خواہشات سے نہیں، شواہد سے سمجھا جائے؛ افراد کے بجائے اصولوں کو معیار بنایا جائے؛ اور سیاسی وابستگی کو تحقیق پر غالب نہ آنے دیا جائے۔ یہی وہ منہج ہے جسے قرآن مجید نے عدل و انصاف کا نام دیا ہے، اور یہی وہ اسلوب ہے جو سنجیدہ تاریخ نویسی کی بنیاد بھی ہے۔

یہ کتاب کسی مکمل تاریخِ کشمیر کا دعویٰ نہیں کرتی، نہ یہ مسئلۂ کشمیر کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش ہے۔ اس کا دائرہ اس سے محدود مگر شاید زیادہ بنیادی ہے۔ یہ ان فکری سوالات پر گفتگو کرتی ہے جنہوں نے ریاست جموں و کشمیر کی سیاست، آزاد کشمیر کے آئینی مباحث، مہاجر نمائندگی، قومی بیانیے، ریاستی اداروں کے کردار، اور تحریکِ آزادی کے مختلف تصورات کو تشکیل دیا۔

خصوصاً "کشمیر: نعروں سے حقیقت تک" کے عنوان سے شامل چار اقساط اسی حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش ہیں کہ کسی قوم کے نعرے محض الفاظ نہیں ہوتے، بلکہ وہ اس کے فکری مزاج، سیاسی ترجیحات اور مستقبل کے تصور کی ترجمانی کرتے ہیں۔ "کشمیر بنے گا پاکستان"، "کشمیر بنے گا خودمختار" اور "کشمیر بنے گا دارالسلام" تین مختلف نعرے ہی نہیں، بلکہ تین مختلف زاویۂ ہائے فکر بھی ہیں۔ ان کو سمجھے بغیر کشمیر کی معاصر سیاست کا صحیح تجزیہ ممکن نہیں۔

اسی طرح کتاب کے دوسرے مضامین یہ واضح کرتے ہیں کہ آئینی سوالات کو غداری اور حب الوطنی کے پیمانوں پر نہیں، بلکہ قانون، انصاف اور تاریخی پس منظر کی روشنی میں دیکھا جانا چاہیے۔ کوئی بھی آئینی بندوبست، خواہ وہ کتنا ہی قدیم کیوں نہ ہو، اگر اس کے بارے میں سنجیدہ سوالات پیدا ہوں تو ان کا جواب دلیل سے دیا جانا چاہیے، خاموشی یا جذبات سے نہیں۔

اس کتاب میں جہاں قرآن و سنت سے رہنمائی لی گئی ہے، وہاں تاریخی دستاویزات، آئینی حقائق، معروف تحقیقی آراء اور مختلف بیانیوں کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ جہاں کوئی مسئلہ اختلافی ہے، وہاں اسے اختلافی ہی رہنے دیا گیا ہے۔ مصنف نے حتی الامکان اس بات سے اجتناب کیا ہے کہ کسی قابلِ اختلاف رائے کو قطعی تاریخی حقیقت کے طور پر پیش کیا جائے۔ کیونکہ علمی دیانت کا تقاضا یہی ہے کہ جہاں یقین ختم ہو جائے، وہاں احتیاط شروع ہو جائے۔

یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ اس کتاب میں بیان کیے گئے بعض تجزیات مصنف کی فہم، مطالعے اور تحقیق کا حاصل ہیں۔ ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، بلکہ علمی دنیا میں اختلاف ہی تحقیق کو زندہ رکھتا ہے۔ تاہم یہ اختلاف دلیل، تحقیق اور اخلاق کے دائرے میں ہونا چاہیے، کیونکہ تہذیب یافتہ معاشروں میں افکار کا جواب افکار سے دیا جاتا ہے، شخصیات سے نہیں۔

اگر اس کتاب کا کوئی مرکزی پیغام بیان کرنا ہو تو شاید وہ یہی ہوگا کہ کشمیر کا مسئلہ صرف سرحدوں کا مسئلہ نہیں، بلکہ اصولوں کا مسئلہ بھی ہے؛ صرف سیاست کا مسئلہ نہیں، بلکہ عدل کا مسئلہ بھی ہے؛ صرف ریاستوں کا مسئلہ نہیں، بلکہ انسانوں کا مسئلہ بھی ہے۔ اور جب تک ان تمام پہلوؤں کو ایک ساتھ نہیں دیکھا جائے گا، ہماری گفتگو ادھوری رہے گی۔

میری دعا ہے کہ یہ کتاب قاری کو کسی مخصوص نتیجے پر مجبور نہ کرے، بلکہ اسے سوچنے، تحقیق کرنے، سوال اٹھانے اور دلائل کی روشنی میں اپنی رائے قائم کرنے کی ترغیب دے۔ اگر یہ تحریریں جذبات سے بلند ہو کر انصاف، توازن اور علمی دیانت کے ساتھ مسئلۂ کشمیر کو سمجھنے میں معمولی سا کردار بھی ادا کر سکیں، تو میں اپنی اس کاوش کو بارگاہِ الٰہی میں مقبول سمجھوں گا۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ

زاہد اقبال فاروقی

تعارفِ کتاب

ہر قوم کی تاریخ صرف واقعات کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ وہ افکار، نظریات، فیصلوں، غلطیوں، کامیابیوں اور اجتماعی شعور کی تشکیل کا نام بھی ہے۔ جو قومیں اپنی تاریخ کو صرف جذبات کے آئینے میں دیکھتی ہیں، وہ اس سے سبق نہیں سیکھ پاتیں؛ جبکہ جو قومیں اپنی تاریخ کا مطالعہ دیانت، تحقیق اور انصاف کے ساتھ کرتی ہیں، وہ اپنے حال کو بہتر اور مستقبل کو زیادہ مستحکم بنانے کی صلاحیت حاصل کر لیتی ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر کی تاریخ بھی اسی نوعیت کی تاریخ ہے۔ گزشتہ سات دہائیوں میں اس مسئلے پر بے شمار بیانیے تشکیل پائے، مختلف سیاسی نظریات سامنے آئے، آئینی مباحث نے جنم لیا، تحریکوں نے جنم لیا، نعرے بلند ہوئے، قربانیاں دی گئیں، اور وقت کے ساتھ بہت سے تصورات بدلتے بھی رہے۔ لیکن ایک سوال مسلسل اپنی جگہ موجود رہا کہ کیا ہم نے ان تمام مراحل کو تحقیق کی نگاہ سے دیکھا، یا صرف اپنے پسندیدہ بیانیے کو دہراتے رہے؟

زیر نظر کتاب اسی بنیادی سوال سے جنم لینے والی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ یہ کسی سیاسی جماعت کا منشور نہیں، نہ کسی ریاستی ادارے کے حق یا مخالفت میں لکھی گئی دستاویز ہے، اور نہ ہی مسئلۂ کشمیر کی مکمل تاریخ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ اس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ بعض اہم تاریخی، آئینی، فکری اور سیاسی سوالات کو دلیل، شواہد اور علمی دیانت کی روشنی میں قارئین کے سامنے رکھا جائے۔

کتاب میں شامل مضامین مختلف اوقات میں تحریر کیے گئے، لیکن ان سب کا مرکزی دھارا ایک ہی ہے: **ریاست جموں و کشمیر کو جذبات کے بجائے اصولوں، تاریخ اور آئین کی روشنی میں سمجھنا**۔ اسی وجہ سے ان تحریروں کو ترتیب دے کر ایک مستقل کتابی صورت دی گئی ہے تاکہ قاری منتشر مضامین کے بجائے ایک مربوط فکری سفر طے کر سکے۔

اس کتاب کا بنیادی حصہ **"کشمیر: نعروں سے حقیقت تک "**کے عنوان سے چار تفصیلی اقساط پر مشتمل ہے۔ ان میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ "کشمیر بنے گا پاکستان "، "کشمیر بنے گا خودمختار "اور "کشمیر بنے گا دارالسلام "محض عوامی نعرے نہیں تھے، بلکہ تین مختلف فکری اور سیاسی تصورات کے نمائندہ تھے۔ ان نعروں کے تاریخی پس منظر، نظریاتی بنیادوں اور عملی اثرات کا جائزہ لے کر یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کشمیر کی سیاست کن فکری راستوں سے گزرتی ہوئی موجودہ مرحلے تک پہنچی۔

اسی تسلسل میں کتاب کے دیگر مضامین آزاد جموں و کشمیر کے آئینی ڈھانچے، مہاجر نشستوں، ریاستی شناخت، اداروں کے کردار، قومی بیانیے، پاکستان اور کشمیر کے باہمی تعلق، اور بعض معاصر سیاسی مباحث کا تجزیہ کرتے ہیں۔ کوشش یہ رہی ہے کہ ہر موضوع کو شخصیات کے بجائے اصولوں، نعروں کے بجائے دلائل، اور جذبات کے بجائے تحقیق کی بنیاد پر دیکھا جائے۔

اس کتاب میں جہاں قرآنِ مجید اور سنتِ نبوی ﷺ سے رہنمائی لی گئی ہے، وہاں تاریخی دستاویزات، آئینی حقائق اور معروف تحقیقی آراء سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ تاہم جہاں کوئی مسئلہ اختلافی ہے، وہاں اس اختلاف کو دیانت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مصنف نے کسی قابلِ اختلاف رائے کو آخری اور قطعی حقیقت کے طور پر پیش کرنے سے حتی الامکان اجتناب کیا ہے، کیونکہ تحقیق کا تقاضا قطعیت نہیں بلکہ احتیاط، توازن اور انصاف ہے۔

یہ کتاب صرف ماضی کا جائزہ نہیں لیتی بلکہ مستقبل کے لیے بھی ایک سوال چھوڑتی ہے:

اگر کشمیر کا سیاسی مسئلہ کسی بھی صورت میں حل ہو جائے، تو کیا صرف سرحدوں کا تعین قوموں کی تقدیر بدل دیتا ہے؟ یا اس کے لیے عدل، قانون کی بالادستی، اخلاقی قیادت، مضبوط ادارے اور ذمہ دار شہری بھی ناگزیر ہوتے ہیں؟

مصنف کی خواہش یہ نہیں کہ قاری ہر رائے سے اتفاق کرے، بلکہ یہ ہے کہ وہ ہر سوال پر غور کرے۔

اگر یہ کتاب قارئین کو جذباتی ردِعمل کے بجائے علمی مکالمے، تحقیق، انصاف اور اصولی فکر کی طرف مائل کر سکے، تو یہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہوگی۔

زاہد اقبال فاروقی

فہرستِ مضامین

حصہ اوّل

حصہ دوم

حصہ سوم

حصہ چھارم

حصہ اول

کشمیر — نعروں سے حقیقت تک

تعارفی نوٹ

کسی بھی قوم کی سیاسی تاریخ صرف جنگوں، معاہدوں اور حکمرانوں کی تاریخ نہیں ہوتی، بلکہ اس کے افکار، نظریات اور نعروں کی تاریخ بھی ہوتی ہے۔ نعرے محض جذباتی الفاظ نہیں ہوتے بلکہ وہ کسی قوم کے اجتماعی شعور، سیاسی ترجیحات اور مستقبل کے تصور کی عکاسی کرتے ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر کی معاصر تاریخ میں بھی مختلف ادوار میں ایسے نعرے سامنے آئے جنھوں نے نہ صرف عوامی رائے کو متاثر کیا بلکہ تحریکِ آزادی، سیاسی جماعتوں اور ریاستی بیانیوں کی تشکیل میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

اس حصے کا مقصد کسی ایک نعرے کو درست یا غلط ثابت کرنا نہیں، بلکہ ان کے تاریخی پس منظر، فکری بنیادوں اور عملی اثرات کا غیر جانب دار جائزہ لینا ہے۔ یہاں کوشش کی گئی ہے کہ تاریخ کو جذبات یا وابستگیوں کے بجائے تحقیق، شواہد اور اصولی تجزیے کی روشنی میں پڑھا جائے، تاکہ قاری یہ سمجھ سکے کہ مختلف نعروں نے کشمیر کی سیاست اور اجتماعی شعور کو کس طرح تشکیل دیا، اور آج ان سے کیا اسباق اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

کشمیر: نعروں سے حقیقت تک

باب اول

جب نعرے تقدیر ساز بن گئے

تاریخ کا ایک عجیب مزاج ہے۔ وہ کبھی صرف واقعات سے نہیں بنتی، بلکہ ان تصورات سے تشکیل پاتی ہے جو قوموں کے اذہان میں جگہ بنا لیتے ہیں۔ بندوق میدان میں اترنے سے پہلے ایک فکر جنم لیتی ہے، اور فکر کے اظہار کا پہلا وسیلہ اکثر ایک نعرہ ہوتا ہے۔ نعرہ اگرچہ چند الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے، مگر اس کے پس منظر میں ایک پورا نظریہ، ایک سیاسی حکمتِ عملی اور مستقبل کا ایک تصور کارفرما ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی قوم کی سیاسی تاریخ کو سمجھنے کے لیے اس کے نعروں کی تاریخ کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔

کشمیر کی معاصر تاریخ بھی دراصل تین بڑے نعروں کے گرد گھومتی ہے۔ "کشمیر بنے گا پاکستان"، "کشمیر بنے گا خودمختار" اور "کشمیر بنے گا دارالسلام"۔ بظاہر یہ تین جملے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ تین مختلف سیاسی تصورات، تین الگ فکری زاویے اور مستقبل کے تین جداگانہ نقشے ہیں۔ اگر ان نعروں کے پس منظر کو سمجھے بغیر نوے کی دہائی کی سیاست کا مطالعہ کیا جائے تو تاریخ کے کئی ابواب ادھورے رہ جائیں گے۔

1947ء کے بعد کشمیر کا مسئلہ صرف سرحدوں کا تنازع نہیں رہا بلکہ شناخت، حقِ خودارادیت، ریاستی مفادات اور نظریاتی وابستگیوں کا مسئلہ بن گیا۔ پاکستان نے تقسیم ہند کے اصولوں کی بنیاد پر کشمیر کو اپنا فطری حصہ قرار دیا، جبکہ بھارت نے الحاق کی دستاویز کو قانونی بنیاد بنایا۔ اسی کشمکش نے آنے والی دہائیوں میں کشمیری سیاست کو مختلف سمتوں میں تقسیم کر دیا۔

آزاد کشمیر میں مسلم کانفرنس نے "کشمیر بنے گا پاکستان" کو اپنی سیاسی شناخت بنایا۔ یہ نعرہ صرف عوامی جذبات کی ترجمانی نہیں کرتا تھا بلکہ اس کے ذریعے یہ پیغام دیا جاتا تھا کہ کشمیر کا مستقبل پاکستان کے ساتھ وابستگی میں مضمر ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ نعرہ ایک سیاسی علامت بھی بن گیا، اور بعض اوقات اقتدار کی سیاست میں وفاداری کی کسوٹی بھی۔

دوسری طرف مقبوضہ کشمیر میں ایک مختلف فکر پروان چڑھ رہی تھی۔ وہاں ایسے حلقے موجود تھے جو نہ پاکستان سے الحاق کے حامی تھے اور نہ بھارت کے تسلط کو قبول کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اصل منزل ایک خودمختار، آزاد اور خود مختار کشمیر تھی۔ یہی سوچ بعد میں جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ (JKLF) کے سیاسی اور عسکری بیانیے کی بنیاد بنی، جس نے "کشمیر بنے گا خودمختار" کے نعرے کو عوامی سطح پر متعارف کرایا۔

اسی زمانے میں ایک تیسرا تصور بھی موجود تھا، جس پر آج نسبتاً کم گفتگو ہوتی ہے۔ جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبہ کے حلقوں میں "کشمیر بنے گا دارالسلام" کا نعرہ مقبول تھا۔ اس نعرے کا مرکز جغرافیہ نہیں بلکہ نظریہ تھا۔ اس میں یہ تصور پوشیدہ تھا کہ اصل مقصد کسی خاص ریاست سے الحاق نہیں بلکہ ایسا معاشرہ قائم کرنا ہے جہاں اسلام محض انفرادی عبادت نہیں بلکہ اجتماعی زندگی کی بنیاد ہو۔ اس تصور کے مطابق اگر کوئی معاشرہ اسلامی عدل، اخلاق اور قانون پر قائم نہیں تو صرف جغرافیائی تبدیلی سے مقصود حاصل نہیں ہوتا۔

یہاں ایک بنیادی حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ نوے کی دہائی سے پہلے کشمیر کی سیاست میں بندوق کا کردار ثانوی تھا اور سیاست کا بنیادی میدان عوامی تحریکیں، سیاسی جماعتیں اور سفارتی کوششیں تھیں۔ مگر 1989ء کے بعد حالات نے یکسر نئی صورت اختیار کی۔ مسلح جدوجہد نے سیاسی نعروں کو بھی نئی معنویت عطا کر دی۔ اب ہر نعرہ صرف ایک سیاسی خواہش نہیں بلکہ ایک عملی حکمتِ عملی سے وابستہ ہو گیا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اس مرحلے کے بارے میں مختلف تاریخی بیانیے موجود ہیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ افغان جہاد کے بعد پاکستان کی سلامتی کی پالیسی میں کشمیر کو ایک اہم محاذ کے طور پر دیکھا جانے لگا، جبکہ دوسرے محققین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مقبوضہ کشمیر کے اندر بڑھتی ہوئی بے چینی، 1987ء کے انتخابات پر اعتراضات اور مقامی سیاسی عوامل بھی مسلح تحریک کے آغاز کے بنیادی اسباب تھے۔ ایک سنجیدہ محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی ایک بیانیے کو مطلق حقیقت قرار دینے کے بجائے تمام معتبر شواہد کو سامنے رکھے۔

اسی طرح یہ دعویٰ بھی مختلف آراء کا موضوع ہے کہ جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ نے دیگر تنظیموں سے پہلے مسلح جدوجہد اس لیے شروع کی کہ تحریک کی قیادت اس کے ہاتھ میں رہے۔ بعض سابق کارکنان اور تجزیہ نگار اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں، جبکہ دوسرے اسے حد سے زیادہ سادہ تعبیر قرار دیتے ہیں۔ تاریخ کا انصاف یہی ہے کہ اختلافی معاملات کو اختلافی ہی رہنے دیا جائے، نہ کہ انہیں ناقابلِ تردید حقیقت بنا کر پیش کیا جائے۔

آج، تین دہائیاں گزرنے کے بعد، ایک سوال پھر ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ وہ نعرہ کہاں گیا جو کبھی تعلیمی اداروں میں گونجتا تھا: "کشمیر بنے گا دارالسلام"؟ کیا یہ محض بدلتے ہوئے سیاسی حالات کا نتیجہ تھا؟ کیا مسلح تحریک نے مذہبی اور سیاسی ترجیحات کو نئی ترتیب دی؟ یا پھر وقت نے خود نعروں کا انتخاب کر لیا؟ ان سوالات کے جوابات جذبات سے نہیں، تاریخ، دستاویزات اور فکری دیانت سے تلاش کرنے ہوں گے۔
قومیں اس وقت بالغ نظری کا ثبوت دیتی ہیں جب وہ اپنی تاریخ کو عقیدت یا نفرت کی عینک سے نہیں بلکہ تحقیق کی روشنی میں پڑھتی ہیں۔ کشمیر کی تاریخ بھی اسی انصاف کی مستحق ہے۔ اس میں کسی ایک جماعت یا شخصیت کو ہیرو اور دوسرے کو مجرم ثابت کرنے سے زیادہ اہم یہ سمجھنا ہے کہ کن فیصلوں، کن نظریات اور کن نعروں نے ایک پوری نسل کی سوچ، سیاست اور مستقبل پر اثر ڈالا۔ جب تک ہم اس سوال کا غیر جانب دار جواب تلاش نہیں کرتے، تب تک ہم ماضی کو بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکتے اور مستقبل کی سمت بھی متعین نہیں کر سکتے۔

یہ سلسلہ انہی سوالات کے جواب تلاش کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش ہے؛ کیونکہ تاریخ کا مقصد صرف ماضی کو یاد کرنا نہیں، بلکہ حال کو سمجھنا اور مستقبل کے لیے بہتر فیصلوں کی بنیاد فراہم کرنا ہے۔

باب دوم

"کشمیر بنے گا پاکستان" اور "کشمیر بنے گا خودمختار" — دو نعروں کی دو تاریخیں

تاریخ کا مطالعہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ قومیں صرف میدانِ جنگ میں نہیں، بلکہ میدانِ فکر میں بھی اپنا مستقبل متعین کرتی ہیں۔ ہر سیاسی تحریک اپنے ساتھ ایک تصورِ حیات، ایک منزل اور اس منزل تک پہنچنے کا ایک طریقۂ کار لے کر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم کشمیر کی سیاسی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اصل کشمکش صرف سرحدوں کی نہیں تھی، بلکہ دو مختلف سیاسی تصورات کے درمیان بھی تھی۔

ایک تصور یہ تھا کہ کشمیر کی قسمت پاکستان کے ساتھ وابستہ ہے، کیونکہ تقسیمِ ہند کا اصول، مذہبی اکثریت اور برصغیر کے تاریخی حقائق اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ دوسرا تصور یہ تھا کہ کشمیری عوام کو پاکستان اور بھارت، دونوں سے الگ ہو کر اپنی آزاد ریاست قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہی دو تصورات بعد میں دو معروف نعروں کی صورت میں عوام کے سامنے آئے: "کشمیر بنے گا پاکستان" اور "کشمیر بنے گا خودمختار"۔

ان نعروں کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کی پیدائش ایک ہی وقت میں نہیں ہوئی، نہ ہی ان کے پس منظر اور محرکات یکساں تھے۔

1947ء میں ریاست جموں و کشمیر کا بحران پیدا ہوا تو پاکستان کے نزدیک مسئلہ بنیادی طور پر تقسیمِ ہند کے نامکمل ایجنڈے کا تھا۔ چونکہ ریاست کی آبادی کی اکثریت مسلمان تھی، اس لیے پاکستان نے مؤقف اختیار کیا کہ کشمیر کا الحاق پاکستان سے ہونا چاہیے۔ یہی مؤقف بعد میں پاکستان کی سفارتی حکمتِ عملی، سرکاری بیانیے اور آزاد کشمیر کی بڑی سیاسی جماعتوں کا بنیادی نصب العین بن گیا۔

اسی ماحول میں مسلم کانفرنس نے "کشمیر بنے گا پاکستان" کو اپنی سیاسی شناخت بنایا۔ اس نعرے نے کشمیری عوام کے ایک بڑے طبقے کے جذبات کی ترجمانی کی اور وقت گزرنے کے ساتھ یہ محض ایک انتخابی نعرہ نہیں بلکہ ایک نظریاتی وابستگی کی علامت بن گیا۔ خاص طور پر آزاد کشمیر کے سیاسی ماحول میں اس نعرے نے وفاداری، قومی شناخت اور سیاسی ترجیح کی حیثیت اختیار کر لی۔

لیکن تاریخ ہمیشہ یک رخی نہیں ہوتی۔ جس وقت پاکستان کے ساتھ الحاق کا تصور مضبوط ہو رہا تھا، اسی دوران کشمیری سیاست کے اندر ایک دوسرا فکری دھارا بھی موجود تھا۔ اس دھارے کے نزدیک مسئلہ صرف یہ نہیں تھا کہ کشمیر پاکستان کا حصہ بنے یا بھارت کا، بلکہ اصل سوال یہ تھا کہ کیا کشمیری عوام کو اپنی آزاد سیاسی شناخت قائم کرنے کا حق حاصل ہے؟

یہ سوچ ابتدا میں محدود حلقوں تک رہی، لیکن وقت کے ساتھ اس نے ایک منظم شکل اختیار کر لی۔ بعدازاں جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ نے اسی تصور کو اپنی سیاست اور جدوجہد کی بنیاد بنایا۔ "کشمیر بنے گا خودمختار" دراصل اسی فکر کا اظہار تھا۔

یہاں ایک اہم حقیقت قابلِ توجہ ہے۔ اکثر سیاسی مباحث میں ان دونوں نعروں کو یوں پیش کیا جاتا ہے جیسے ایک حق پر تھا اور دوسرا باطل پر، یا ایک مکمل طور پر عوامی تھا اور دوسرا مکمل طور پر بیرونی اثرات کا نتیجہ۔ مگر سنجیدہ تاریخ نویسی اس قسم کی سادہ تقسیم کو قبول نہیں کرتی۔

حقیقت یہ ہے کہ دونوں نعروں کے پیچھے کشمیری معاشرے کے حقیقی طبقات، حقیقی سیاسی خواہشات اور مختلف تاریخی تجربات کارفرما تھے۔ اختلاف منزل کے تعین پر تھا، جذبۂ مزاحمت پر نہیں۔

1980ء کی دہائی کے آخر میں حالات نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ مقبوضہ کشمیر میں سیاسی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ 1987ء کے انتخابات پر وسیع پیمانے پر اعتراضات سامنے آئے، اور نوجوانوں کے ایک حصے میں یہ احساس پیدا ہوا کہ روایتی سیاسی ذرائع سے تبدیلی ممکن نہیں رہی۔ اسی ماحول میں مسلح جدوجہد نے جنم لیا۔

یہاں سے تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔

بعض محققین کے مطابق افغان جہاد کے بعد خطے کی تزویراتی سیاست میں تبدیلی آئی اور پاکستان نے کشمیر کو اپنی سلامتی کی حکمتِ عملی کا ایک اہم محاذ سمجھنا شروع کیا۔ دوسری طرف متعدد کشمیری مصنفین اس امر پر زور دیتے ہیں کہ اگر مقبوضہ کشمیر کے اندر سیاسی بے چینی، عوامی اضطراب اور انتخابی بحران موجود نہ ہوتا تو بیرونی حمایت تنہا ایک وسیع عوامی تحریک کو جنم نہیں دے سکتی تھی۔

غور کیا جائے تو دونوں نقطۂ نظر ایک دوسرے کی مکمل نفی نہیں کرتے۔ تاریخ اکثر ایک ہی سبب سے نہیں بنتی بلکہ کئی عوامل مل کر ایک نئے دور کو جنم دیتے ہیں۔ کشمیر کی مسلح تحریک بھی داخلی اور خارجی عوامل کے امتزاج کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

اسی زمانے میں ایک اور تبدیلی بھی رونما ہوئی۔ ابتدا میں جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ کو جو عوامی توجہ حاصل ہوئی تھی، وہ آہستہ آہستہ دیگر تنظیموں کے ابھرنے سے تقسیم ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی سیاسی بیانیے بھی تبدیل ہونے لگے۔ آزادی کا نعرہ، الحاق کا نعرہ اور اسلامی نظام کا نعرہ ایک دوسرے کے مدمقابل آ گئے۔ یوں محسوس ہونے لگا کہ اب اصل مقابلہ صرف بھارت اور پاکستان کے درمیان نہیں، بلکہ کشمیری سیاسی فکر کے اندر بھی جاری ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں ایک بنیادی سوال جنم لیتا ہے۔ اگر مقصد صرف بھارت سے آزادی تھا تو آزادی کے بعد کی منزل پر اس قدر اختلاف کیوں پیدا ہوا؟ اور اگر منزل پہلے سے واضح تھی تو پھر ایک ہی قوم کے اندر تین مختلف نعرے کیوں مقبول ہوئے؟

ان سوالات کا جواب اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ ہر سیاسی تحریک اپنے ساتھ مستقبل کا ایک نقشہ بھی لاتی ہے۔ بعض تحریکوں کے نزدیک جغرافیہ اصل مسئلہ ہوتا ہے، بعض کے نزدیک قومی شناخت، اور بعض کے نزدیک نظریۂ حیات۔ کشمیر کی سیاست میں یہ تینوں تصورات بیک وقت موجود رہے، اسی لیے اس کے نعروں میں بھی یہ تنوع دکھائی دیتا ہے۔

اسی تناظر میں تیسرا نعرہ — "کشمیر بنے گا دارالسلام" — محض ایک جذباتی نعرہ نہیں تھا بلکہ ایک مختلف فکری زاویے کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس کا تعلق صرف ریاست کے جغرافیے سے نہیں بلکہ اس معاشرتی و اخلاقی نظام سے تھا جو اس ریاست کی بنیاد بننا چاہیے۔

یہی نکتہ ہماری اگلی قسط کا موضوع ہوگا، جہاں ہم اس سوال کا جائزہ لیں گے کہ جماعت اسلامی نے "دارالسلام" کا تصور کیوں پیش کیا، اس کی فکری بنیاد کیا تھی، اور پھر وہ نعرہ رفتہ رفتہ عوامی سیاست کے منظرنامے سے کیوں اوجھل ہوتا چلا گیا۔

باب سوم

"کشمیر بنے گا دارالسلام" — ایک نعرہ، ایک نظریہ یا ایک فکری تعبیر؟

گزشتہ دو اقساط میں یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ کشمیر کی معاصر تاریخ صرف سیاسی واقعات، جنگوں اور سفارتی کشمکش کی تاریخ نہیں بلکہ تصورات، نظریات اور نعروں کی بھی تاریخ ہے۔

"کشمیر بنے گا پاکستان" اور "کشمیر بنے گا خودمختار" دو ایسے سیاسی تصورات تھے جنہوں نے گزشتہ کئی دہائیوں تک کشمیری سیاست کی سمت متعین کی۔ لیکن انہی کے درمیان ایک تیسرا شعار بھی موجود تھا جس کا ذکر وقت گزرنے کے ساتھ مدھم ہوتا گیا، حالانکہ ایک زمانے میں مذہبی اور طلبہ حلقوں میں وہ خاصا معروف تھا۔ یہ شعار تھا: "کشمیر بنے گا دارالسلام"۔

یہاں ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا یہ صرف ایک سیاسی نعرہ تھا؟ کیا یہ خودمختاری کے تصور کا مذہبی متبادل تھا؟ یا پھر یہ جماعت اسلامی کی اس وسیع تر فکری روایت کا اظہار تھا جس میں ریاست کو محض اقتدار یا جغرافیے کا نام نہیں بلکہ اللہ کی امانت اور اخلاقی ذمہ داری سمجھا جاتا ہے؟

اس سوال کا جواب جذبات، سیاسی وابستگی یا محض یادداشتوں سے نہیں بلکہ قرآن، سنت، اسلامی فکر، جماعت اسلامی کے دستوری مؤقف اور دستیاب تاریخی شواہد کی روشنی میں تلاش کرنا چاہیے۔

سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ "دارالسلام" جماعت اسلامی کی ایجاد کردہ اصطلاح نہیں بلکہ قرآن مجید کی اصطلاح ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

«﴿وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾

"اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی ہدایت دیتا ہے۔" (یونس: 25)»

یہ آیت محض آخرت کی بشارت نہیں بلکہ اس اصول کی بھی رہنمائی کرتی ہے کہ اللہ کی ہدایت کا راستہ امن، عدل اور اخلاقی نظم کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی لیے اسلام میں سلامتی صرف جنگ نہ ہونے کا نام نہیں بلکہ ایسا معاشرہ ہے جہاں انسان کے جان، مال، عزت، دین اور انصاف سب محفوظ ہوں۔

اسی حقیقت کو مزید واضح کرنے کے لیے قرآن رسول اکرم ﷺ کو یہ دعا سکھاتا ہے:

«﴿رَبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَل لِّي مِن لَّدُنكَ سُلْطَانًا نَّصِيرًا﴾

"اے میرے رب! مجھے سچائی کے ساتھ داخل فرما، سچائی کے ساتھ نکال، اور اپنی طرف سے ایسی قوت عطا فرما جو میری مددگار ہو۔" (الإسراء: 80)»

یہ دعا اس حقیقت کو نمایاں کرتی ہے کہ اسلام اقتدار کا طالب ضرور ہے، مگر ایسا اقتدار جو صداقت، عدل اور اللہ کی نصرت کے تابع ہو۔ اقتدار بذاتِ خود مقصد نہیں بلکہ عدل کے قیام کا ذریعہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
«"إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ صَالِحَ الْأَخْلَاقِ"»

"مجھے بہترین اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔"

اس حدیث کی روشنی میں بھی اسلامی جدوجہد کا اصل ہدف صرف حکومت حاصل کرنا نہیں بلکہ ایک صالح معاشرے کی تعمیر ہے۔

اسی تصور کو سامنے رکھ کر جماعت اسلامی کی فکری روایت کو دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اس کا بنیادی نصب العین ہمیشہ اقامتِ دین رہا ہے۔ جماعت اسلامی پاکستان، جماعت اسلامی آزاد جموں و کشمیر اور جماعت اسلامی مقبوضہ جموں و کشمیر کے دساتیر میں اسلامی نظامِ زندگی کے قیام کو بنیادی مقصد قرار دیا گیا ہے، جبکہ جماعت اسلامی آزاد جموں و کشمیر نے ریاست جموں و کشمیر کے پاکستان سے الحاق کی جدوجہد کو اپنی سیاسی ذمہ داری کے طور پر اختیار کیا ہے۔
یہ ترتیب غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی کے نزدیک الحاقِ پاکستان اپنی ذات میں آخری منزل نہیں بلکہ ایک ایسے ماحول کے قیام کا ذریعہ ہے جہاں اسلامی نظامِ حیات نافذ ہو سکے۔ سیاست، دین کے تابع ہے؛ دین، سیاست کے تابع نہیں۔

اسی تناظر میں "دارالسلام" کی تعبیر کو سمجھنا چاہیے۔

برصغیر میں جماعت اسلامی کے اولین مرکز کا نام بھی دارالسلام رکھا گیا تھا۔ یہ محض ایک نام نہیں بلکہ ایک فکری علامت تھی۔ اسی طرح سندھ کو صدیوں سے باب الاسلام کہا جاتا ہے۔ ان تعبیرات کا مقصد کسی مخصوص سیاسی نقشے کی تشکیل نہیں بلکہ اسلامی تہذیب، دعوت اور معاشرتی تعمیر کی طرف اشارہ تھا۔

میری تحقیق اور فہم کے مطابق جماعت اسلامی آزاد جموں و کشمیر، جماعت اسلامی جموں و کشمیر، جماعت اسلامی پاکستان یا جماعت اسلامی ہند نے "دارالسلام" کو اس معنی میں کبھی باقاعدہ سیاسی نعرے کے طور پر اختیار نہیں کیا جس طرح "کشمیر بنے گا پاکستان" یا "کشمیر بنے گا خودمختار" سیاسی نعروں کے طور پر معروف ہوئے۔ البتہ 1980ء کی دہائی اور 1989ء کے آس پاس کے ماحول میں جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکنوں کے درمیان یہ شعار نمایاں طور پر استعمال ہوتا تھا۔

راقم کو بھی اپنا بچپن اچھی طرح یاد ہے، جب یہی الفاظ دیواروں پر لکھے جاتے تھے اور نوجوان کارکن انہیں اپنی دعوتی سرگرمیوں کا حصہ بناتے تھے۔ یہ ذاتی یادداشت اگرچہ قطعی تاریخی ثبوت نہیں، لیکن اس دور کی عوامی فضا کی ایک اہم زبانی شہادت ضرور ہے۔

غالب امکان یہی ہے کہ جب "کشمیر بنے گا خودمختار" کا نعرہ تیزی سے مقبول ہونے لگا تو جماعت اسلامی نے اس کے جواب میں کوئی متبادل جغرافیائی منصوبہ پیش کرنے کے بجائے اسلامی شناخت اور اسلامی معاشرے کے تصور کو نمایاں کیا۔ اس لیے "دارالسلام" کو ایک نظریاتی اور اخلاقی تعبیر کے طور پر زیادہ سمجھا جا سکتا ہے، نہ کہ خودمختاری کے مقابل ایک الگ سیاسی منصوبے کے طور پر۔

1989ء کے بعد کشمیر کی تحریک ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی۔ مسلح جدوجہد نے سیاسی منظرنامے کو یکسر بدل دیا۔ عوامی بحث کا محور یہ بن گیا کہ کون سی تنظیم مزاحمت کی قیادت کر رہی ہے اور کس کا سیاسی مؤقف زیادہ مؤثر ہے۔ ایسے حالات میں مختصر اور واضح سیاسی نعرے غالب آ گئے، جبکہ فکری اور نظریاتی اصطلاحات بتدریج پس منظر میں چلی گئیں۔

اسی تاریخی تناظر میں ایک اور اہم حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ نوے کی دہائی کے بعد، خصوصاً سید علی گیلانیؒ کی قیادت میں، کشمیر کی مزاحمتی سیاست میں ایسے نعرے زیادہ نمایاں ہوئے جنہوں نے اسلامی تشخص اور الحاقِ پاکستان کے تصور کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا۔ "پاکستان سے رشتہ کیا؟ لا إله إلا الله" اور "ہم پاکستانی ہیں، پاکستان ہمارا ہے" جیسے نعرے صرف سیاسی وابستگی کے اظہار تک محدود نہیں تھے، بلکہ وہ اس فکر کی ترجمانی بھی کرتے تھے کہ پاکستان سے تعلق کی بنیاد محض جغرافیہ یا سیاسی مصلحت نہیں بلکہ مشترک دینی شناخت اور اسلامی نظریۂ حیات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت اسلامی اور سید علی گیلانیؒ کے سیاسی و فکری بیانیے میں الحاقِ پاکستان کا مطالبہ کبھی محض قومی قومیت (Nationalism) کے پیرائے میں پیش نہیں ہوا، بلکہ اسے اسلام، امت اور نظریاتی وابستگی کے ساتھ مربوط کر کے بیان کیا گیا۔ اس اعتبار سے اگرچہ "دارالسلام" کی اصطلاح عوامی نعروں میں بتدریج کم ہوتی گئی، لیکن اس کے پس منظر میں موجود بنیادی فکر—یعنی اسلامی اصولوں پر قائم ایک عادلانہ معاشرہ—مختلف تعبیرات کے ساتھ تحریکِ آزادی کے ایک اہم فکری دھارے میں موجود رہی۔

حقیقت یہ ہے کہ الفاظ بدل جانا ہمیشہ افکار کے بدل جانے کی دلیل نہیں ہوتا۔ تاریخ میں بہت سے ایسے مواقع آئے ہیں جب حالات کے تقاضوں نے دعوت کی زبان بدل دی، مگر دعوت کا جوہر وہی رہا۔ اگر کسی دور میں "دارالسلام" کی اصطلاح زیادہ نمایاں تھی اور بعد کے دور میں "پاکستان سے رشتہ کیا؟ لا إله إلا الله" جیسا نعرہ غالب آ گیا، تو اس سے لازماً یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ بنیادی فکر تبدیل ہو گئی۔ زیادہ قرین قیاس بات یہ ہے کہ ایک ہی نظریاتی تصور نے مختلف ادوار میں مختلف سیاسی اور دعوتی تعبیرات اختیار کیں۔ یہی زاویۂ نگاہ اس پوری بحث کو جذبات کے بجائے تحقیق کے دائرے میں رکھتا ہے۔

اسی لیے یہ کہنا زیادہ قرینِ انصاف معلوم ہوتا ہے کہ "دارالسلام" کی اصطلاح عوامی استعمال میں ضرور کم ہوتی گئی، لیکن جماعت اسلامی کی بنیادی فکری ترجیحات میں اقامتِ دین، عدلِ اجتماعی اور اسلامی معاشرے کا تصور برقرار رہا۔

اس پوری بحث کا حاصل صرف ایک نعرے کی تاریخ نہیں بلکہ ایک بڑے سوال کی طرف رہنمائی ہے۔

اگر کشمیر کو آزادی حاصل ہو جائے تو اس آزادی کا مقصد کیا ہوگا؟ کیا صرف اقتدار کی منتقلی قوموں کی تقدیر بدل دیتی ہے؟ کیا صرف جغرافیہ تبدیل ہو جانے سے انسان کو انصاف، امن اور عزت بھی مل جاتی ہے؟ یا پھر ایک ایسے نظام کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو قانون کی بالادستی، اخلاقی تطہیر، عدلِ اجتماعی اور اللہ کی ہدایت پر قائم ہو؟

حقیقت یہ ہے کہ یہی سوال "دارالسلام" کے تصور کی روح ہے۔ اسی لیے اسے محض ایک سیاسی نعرہ سمجھنا اس کے مفہوم کو محدود کر دینا ہے۔ یہ دراصل اس فکر کا اظہار ہے کہ کسی بھی آزادی کی اصل قدر اس نظام سے متعین ہوتی ہے جو آزادی کے بعد قائم کیا جائے۔

اس لیے میری تحقیق کا نچوڑ یہی ہے کہ "کشمیر بنے گا دارالسلام" کو ایک فکری و تحریکی تعبیر کے طور پر سمجھنا زیادہ مناسب ہے۔ اس کا مقصد کسی نئے سیاسی نقشے کی تشکیل نہیں بلکہ اس بنیادی حقیقت کی یاد دہانی تھا کہ مسلمان کی جدوجہد کی آخری منزل صرف اقتدار کا حصول نہیں بلکہ اللہ کی ہدایت کے مطابق ایک عادلانہ، پرامن اور صالح معاشرے کا قیام ہے۔

شاید آج، جب کشمیر کی سیاست ایک بار پھر نئے سوالات سے دوچار ہے، اس تصور کو جذبات سے ہٹ کر علمی دیانت کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے؛ کیونکہ قوموں کا مستقبل صرف نعروں سے نہیں بلکہ ان اصولوں سے تشکیل پاتا ہے جن پر وہ اپنے سیاسی اور اجتماعی نظام کی بنیاد رکھتی ہیں۔

اس بحث کا اختتام یہیں نہیں ہوتا۔ اگر "کشمیر بنے گا پاکستان"، "کشمیر بنے گا خودمختار" اور "کشمیر بنے گا دارالسلام" تین مختلف فکری و سیاسی تعبیرات تھیں، تو ایک بنیادی سوال اب بھی تشنۂ جواب ہے: ان میں سے کس تصور نے کشمیر کی سیاست، عوامی شعور اور تحریکِ آزادی پر سب سے گہرے اثرات مرتب کیے؟ کون سے اہداف حاصل ہوئے، کہاں غلطیاں سرزد ہوئیں، اور آئندہ کے لیے کون سے اسباق اخذ کیے جا سکتے ہیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا تعلق صرف ماضی سے نہیں بلکہ کشمیر کے مستقبل سے بھی ہے۔ اسی لیے اس سلسلے کی آئندہ اور آخری قسط میں ہم جذبات سے ہٹ کر انہی نعروں کا تقابلی تجزیہ کریں گے، ان کے عملی نتائج کا جائزہ لیں گے، اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ تاریخ ہمیں کیا سکھاتی ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے اس میں کیا رہنمائی پوشیدہ ہے۔

باب چہارم

نعروں سے آگے — تاریخ کے اسباق اور مستقبل کی سمت

گزشتہ تین اقساط میں ہم نے کشمیر کی معاصر تاریخ کو تین معروف نعروں کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی۔ پہلی قسط میں یہ واضح کیا گیا کہ نعرے محض جذباتی آوازیں نہیں ہوتے بلکہ وہ کسی قوم کے سیاسی شعور، فکری رجحان اور مستقبل کے تصور کی عکاسی کرتے ہیں۔ دوسری قسط میں "کشمیر بنے گا پاکستان" اور "کشمیر بنے گا خودمختار" کے تاریخی پس منظر، ان کے فکری سرچشموں اور سیاسی اثرات کا جائزہ لیا گیا۔ تیسری قسط میں "کشمیر بنے گا دارالسلام" کے تصور کو قرآن، سنت، اسلامی فکر، جماعت اسلامی کی فکری روایت اور کشمیر کی سیاسی تاریخ کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی گئی۔

اب سوال یہ ہے کہ اس پوری بحث کا حاصل کیا ہے؟ کیا یہ صرف نعروں کی تاریخ ہے، یا اس کے اندر آج کے کشمیر کے لیے بھی کوئی رہنمائی پوشیدہ ہے؟

تاریخ کا پہلا سبق یہ ہے کہ قوموں کی تقدیر صرف نعروں سے نہیں بدلتی۔ نعرہ کسی تحریک کی شناخت ضرور بن سکتا ہے، مگر وہ اس وقت تک تاریخ ساز قوت نہیں بنتا جب تک اس کے پیچھے ایک واضح فکر، صالح قیادت، اخلاقی کردار اور درست حکمتِ عملی موجود نہ ہو۔ الفاظ لوگوں کو جمع کر سکتے ہیں، لیکن صرف کردار ہی انہیں منزل تک پہنچاتا ہے۔

کشمیر کی گزشتہ سات دہائیوں کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے۔ "کشمیر بنے گا پاکستان" نے تقسیمِ ہند کے اصول، مسلمانوں کی اکثریت اور پاکستان کے ساتھ تاریخی، مذہبی اور تہذیبی رشتے کو اپنی بنیاد بنایا۔ "کشمیر بنے گا خودمختار" نے حقِ خودارادیت اور کشمیری قومی تشخص کو اپنی فکر کا مرکز بنایا۔ جبکہ "کشمیر بنے گا دارالسلام" نے اس سوال کو نمایاں کیا کہ اگر منزل حاصل بھی ہو جائے تو اس کے بعد قائم ہونے والا نظام کس اصول پر استوار ہوگا۔

غور کیا جائے تو یہ تینوں نعرے صرف سیاسی اختلاف کی علامت نہیں تھے بلکہ تین مختلف فکری زاویوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ ایک جغرافیائی الحاق کی بات کرتا تھا، دوسرا قومی خودمختاری کی، اور تیسرا اس اخلاقی اور تہذیبی نظام کی جو آزادی کے بعد وجود میں آنا چاہیے۔

قرآن مجید انسان اور معاشرے کی تبدیلی کا جو اصول بیان کرتا ہے، وہ آج بھی ہر سیاسی تحریک کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾

"بے شک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کرے۔" (الرعد: 11)

یہ آیت صرف انفرادی اصلاح کا درس نہیں دیتی بلکہ اجتماعی زندگی کا بھی ایک دائمی قانون بیان کرتی ہے۔ اگر قوم کے اندر دیانت، عدل، نظم، علم، تقویٰ اور اجتماعی ذمہ داری پیدا نہ ہو تو محض سیاسی آزادی دیرپا خوشحالی اور استحکام کی ضمانت نہیں بن سکتی۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
"كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ."

"تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔"

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ اسلامی سیاست اقتدار کی کشمکش نہیں بلکہ امانت، جواب دہی اور خدمتِ خلق کا نام ہے۔ جب سیاست اخلاق سے جدا ہو جائے تو نعرے باقی رہ جاتے ہیں مگر ان کی روح رخصت ہو جاتی ہے۔

کشمیر کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ادوار میں مختلف نعروں نے عوامی مقبولیت حاصل کی، مگر حالات کے بدلنے کے ساتھ ان کی ترجیحات بھی تبدیل ہوتی رہیں۔ 1989ء کے بعد مسلح تحریک نے سیاسی منظرنامے کو یکسر بدل دیا۔ عوامی مباحث کا مرکز یہ بن گیا کہ کون سی تنظیم زیادہ مؤثر مزاحمت کر رہی ہے۔ اس ماحول میں طویل فکری مباحث پس منظر میں چلے گئے اور مختصر، مؤثر اور جذبات کو ابھارنے والے نعرے غالب آ گئے۔

اسی زمانے میں سید علی گیلانیؒ کی قیادت میں ایسے نعرے زیادہ نمایاں ہوئے جنھوں نے اسلامی شناخت اور الحاقِ پاکستان کے تصور کو باہم مربوط کیا۔ "پاکستان سے رشتہ کیا؟ لا إلہ إلا اللہ" اور "ہم پاکستانی ہیں، پاکستان ہمارا ہے" جیسے نعروں نے اس بات کو اجاگر کیا کہ پاکستان سے وابستگی محض سیاسی یا جغرافیائی مسئلہ نہیں بلکہ ایک نظریاتی تعلق بھی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کشمیر کی ایک بڑی فکری روایت میں الحاقِ پاکستان کو اسلام سے جدا کر کے نہیں دیکھا گیا۔

اسی تناظر میں "دارالسلام" کے تصور کو بھی سمجھنا چاہیے۔ یہ کسی متبادل ریاستی منصوبے کا نام نہیں تھا بلکہ اس یاد دہانی کا اظہار تھا کہ آزادی کے بعد قائم ہونے والا معاشرہ اسلامی عدل، اخلاق، قانون کی بالادستی اور انسانی وقار کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ اگر اصطلاح عوامی استعمال میں کم ہوتی گئی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے پس منظر میں موجود فکر بھی ختم ہو گئی۔ الفاظ بدل سکتے ہیں، لیکن اصول باقی رہتے ہیں۔

اس پوری بحث کا ایک اور اہم سبق یہ ہے کہ تاریخ کو نعروں کی بنیاد پر اچھے اور برے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ہر نعرہ اپنے عہد، اپنے حالات اور اپنے فکری پس منظر میں سمجھا جانا چاہیے۔ جو قومیں اپنی تاریخ کو صرف جذبات کے پیمانے پر پرکھتی ہیں، وہ اس سے سبق نہیں سیکھ پاتیں؛ جبکہ جو قومیں تاریخ کو دیانت، تحقیق اور انصاف کے ساتھ پڑھتی ہیں، وہ مستقبل کی تعمیر کے لیے صحیح بنیاد فراہم کرتی ہیں۔

آزادی یا نظام؟

اس پوری بحث کے بعد شاید سب سے بنیادی سوال یہی ہے کہ اگر کل کشمیر کا سیاسی مسئلہ کسی بھی صورت میں حل ہو جائے تو اس کے بعد کیا ہوگا؟

کیا صرف ایک نئی سرحد قائم ہو جانے سے ظلم ختم ہو جائے گا؟ کیا صرف ایک نیا پرچم لہرا دینے سے عدل قائم ہو جائے گا؟ کیا صرف اقتدار کی منتقلی سے معاشرے میں دیانت، امانت، قانون کی بالادستی اور انسانی وقار پیدا ہو جائے گا؟

اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہے، تو پھر یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ آزادی اپنی ذات میں آخری منزل نہیں بلکہ ایک وسیلہ ہے۔ اصل منزل وہ نظام ہے جو آزادی کو انصاف میں بدل دے، اقتدار کو امانت بنا دے، قانون کو طاقتور کے بجائے حق کا محافظ بنا دے، اور انسان کو انسان کا غلام نہیں بلکہ صرف اللہ کا بندہ بنائے۔

قرآن مجید اقتدار کے مقصد کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:
﴿الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ﴾

"یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔" (الحج: 41)

غور کیجیے، قرآن اقتدار کو کامیابی نہیں کہتا بلکہ اقتدار کے بعد کی ذمہ داری بیان کرتا ہے۔ گویا اسلامی نقطۂ نظر میں اصل سوال یہ نہیں کہ اقتدار کس کے ہاتھ میں آیا، بلکہ یہ ہے کہ اقتدار کا استعمال کس مقصد کے لیے ہوا۔

یہی وہ نکتہ ہے جس کی طرف "دارالسلام" کا تصور رہنمائی کرتا ہے۔ ریاست کا مقصد صرف حدود کی حفاظت نہیں بلکہ حدود اللہ کی پاسداری ہے؛ صرف آزادی نہیں بلکہ عدل؛ صرف حکومت نہیں بلکہ امانت؛ صرف اقتدار نہیں بلکہ بندگیِ رب۔

اس لیے اگر "کشمیر بنے گا پاکستان"، "کشمیر بنے گا خودمختار" اور "کشمیر بنے گا دارالسلام" کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کرنے کے بجائے ان کے فکری پس منظر کو سمجھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تینوں کشمیر کے مستقبل سے متعلق تین مختلف سوالات اٹھاتے ہیں۔ پہلا سوال سیاسی وابستگی کا ہے، دوسرا قومی خوداختیاری کا، اور تیسرا اس نظامِ زندگی کا جو آزادی کے بعد قائم ہونا چاہیے۔

شاید اسی لیے تاریخ کا فیصلہ نعروں کی گونج سے نہیں بلکہ ان کے نتائج سے ہوتا ہے۔ قومیں اس وقت ترقی کرتی ہیں جب ان کے نعرے کردار میں ڈھل جائیں، ان کی سیاست اصولوں کی پابند ہو، ان کے ادارے انصاف کے محافظ ہوں اور ان کی آزادی اخلاقی ذمہ داری کے احساس سے وابستہ ہو۔ بصورتِ دیگر، آزادی بھی ایک نئے استبداد کو جنم دے سکتی ہے۔

کشمیر کا مقدمہ آج بھی صرف سرحدوں، سفارت کاری یا عسکری حکمتِ عملی کا مقدمہ نہیں، بلکہ فکر، قیادت، اخلاق، قانون اور اجتماعی کردار کا مقدمہ بھی ہے۔ جب تک یہ ستون مضبوط نہیں ہوں گے، کوئی بھی نعرہ اپنی کامل تعبیر حاصل نہیں کر سکے گا۔

یہی اس پوری بحث کا حاصل ہے۔ اگر اس سلسلے نے قاری کو کسی ایک نعرے کا حامی بنانے کے بجائے تاریخ کو زیادہ دیانت، توازن اور فکری گہرائی کے ساتھ سمجھنے پر آمادہ کیا ہے تو یہی اس کی کامیابی ہے۔ کیونکہ قوموں کا مستقبل نعروں سے نہیں، ان اصولوں سے تشکیل پاتا ہے جن پر وہ اپنے اجتماعی نظام کی بنیاد رکھتی ہیں، اور یہی وہ ابدی سبق ہے جو کشمیر کی تاریخ بھی دیتی ہے اور قرآن کی ہدایت بھی۔

حصہ دوم

کشمیر — آئین، نمائندگی اور ریاستی سوالات

تعارفی نوٹ

کشمیر کا مسئلہ صرف تاریخ اور جذبات کا موضوع نہیں بلکہ آئینی، قانونی اور سیاسی اصولوں کا بھی سوال ہے۔ کسی بھی ریاست یا نظام کی پائیداری کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ عدل، نمائندگی، آئین کی بالادستی اور عوامی اعتماد جیسے بنیادی اصولوں پر کس حد تک قائم ہے۔

اس حصے میں آزاد جموں و کشمیر کے سیاسی و آئینی ڈھانچے سے متعلق چند اہم سوالات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

مہاجر نشستوں کی آئینی بنیاد، نمائندگی کے اصول، ریاستی اداروں کا کردار اور حالیہ سیاسی بحران جیسے موضوعات کو جذبات یا گروہی وابستگی کے بجائے تاریخی شواہد، آئینی اصولوں اور علمی استدلال کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس حصے کا مقصد کسی فریق کی تائید یا مخالفت نہیں، بلکہ ایسے سوالات کو دلیل کے ساتھ زیر بحث لانا ہے جو ایک مضبوط، عادلانہ اور جواب دہ سیاسی نظام کی تشکیل کے لیے ناگزیر ہیں۔

باب پنجم

مہاجر نشستیں: ایک اصولی سوال

اس بحث میں داخل ہونے سے پہلے ایک بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ میرا اپنا خاندان بھی اُن لاکھوں کشمیری خاندانوں میں شامل ہے جنہوں نے 1947ء کے پُرآشوب حالات میں جموں و کشمیر سے ہجرت کی۔ ہمارے عزیز و اقارب آج بھی آزاد کشمیر اور پنجاب کے مختلف شہروں سمیت کراچی اور دارالحکومت اسلام آباد میں آباد ہیں۔ لہٰذا یہ گفتگو نہ مہاجرینِ کشمیر کے خلاف ہے اور نہ ان کی قربانیوں کے انکار کے لیے۔ سوال صرف ایک اصول کا ہے، اور اصول ہمیشہ اشخاص اور جماعتوں سے بلند ہوتے ہیں۔

ہر سیاسی نظام کی صحت کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ عدل کے کس معیار پر قائم ہے۔ اسلام میں اقتدار کوئی اعزاز نہیں بلکہ امانت ہے، اور امانت کا تقاضا یہ ہے کہ معاملات ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوں جو ان کے نتائج کے سامنے جواب دہ ہوں۔

آزاد کشمیر کی مہاجر نشستوں کے بارے میں آج جو بحث جاری ہے، اسے بھی اسی اصول کی روشنی میں دیکھا جانا چاہیے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کی تقسیم اور اس کے بعد کے حالات میں لاکھوں افراد اپنے گھروں سے بے دخل ہوئے۔ ان کے دکھ، قربانیاں اور مسئلۂ کشمیر سے وابستگی کسی دلیل کے محتاج نہیں۔ لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ سیاسی نظام صرف جذبات پر نہیں بلکہ اصولوں پر قائم ہوتے ہیں۔

دستیاب تاریخی ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاجر نمائندگی کا تصور 1974ء کے عبوری آئین سے پہلے بھی کسی نہ کسی صورت موجود تھا۔ آزاد کشمیر کی سپریم کورٹ نے اپنے حالیہ فیصلے میں 1960، 1964 اور 1970 کے قانونی انتظامات کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن آج تک عوام کے سامنے یہ سوال پوری وضاحت سے نہیں آ سکا کہ آخر وہ کون سے قوانین، قواعد یا صدارتی آرڈرز تھے جنہوں نے اس نمائندگی کی بنیاد رکھی اور بعد ازاں اسے موجودہ شکل تک پہنچایا۔

یہ سوال اس لیے اہم ہے کہ کسی بھی آئینی بندوبست کی اصل بنیاد اس کی تاریخی اور قانونی حیثیت ہوتی ہے، نہ کہ اس کے حق یا مخالفت میں لگائے جانے والے نعرے۔

البتہ یہ بات واضح ہے کہ 1974ء کے عبوری آئین نے مہاجر نشستوں کو آزاد کشمیر کے موجودہ پارلیمانی ڈھانچے کا حصہ بنا دیا۔ سوال یہ ہے کہ نصف صدی گزر جانے کے بعد کیا اس بندوبست کا ازسرِ نو جائزہ لینا ممنوع ہے؟ کیا ہر وہ قانون جو ایک زمانے میں کسی خاص ضرورت کے تحت بنایا گیا ہو، ہمیشہ کے لیے ناقابلِ سوال قرار دیا جا سکتا ہے؟

جمہوریت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہوں۔ لیکن یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے: عوام سے مراد کون لوگ ہیں؟ کیا وہ جو کسی خطے میں رہتے ہیں، اس کے وسائل استعمال کرتے ہیں، اس کے نظمِ حکومت کے نتائج بھگتتے ہیں اور اس کے مستقبل سے براہِ راست وابستہ ہیں؟ یا وہ بھی جو کئی نسلوں سے اس خطے سے باہر آباد ہیں؟

یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب محض جذبات سے نہیں دیا جا سکتا۔

مہاجر نشستوں کے حامی یہ کہتے ہیں کہ چونکہ مسئلۂ کشمیر ابھی حل طلب ہے، اس لیے مہاجرین کشمیر کو سیاسی نمائندگی سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک قابلِ غور مؤقف ہے۔ لیکن اگر یہ دلیل درست ہے تو پھر اس پر بھی غور ہونا چاہیے کہ نمائندگی کی موجودہ شکل ہی کیوں برقرار رہے؟ کیا کوئی ایسا نظام ممکن نہیں جو ایک طرف مہاجرین کے تاریخی تعلق کو تسلیم کرے اور دوسری طرف مقامی آبادی کے حقِ نمائندگی اور جمہوری مساوات کو بھی متاثر نہ کرے؟

بدقسمتی سے ہمارے ہاں اکثر آئینی سوالات کو حب الوطنی اور غداری کے پیمانوں سے ناپا جاتا ہے۔ حالانکہ کسی قانون یا آئینی بندوبست پر سوال اٹھانا بغاوت نہیں بلکہ اصلاح کا پہلا قدم ہے۔ جو قومیں اپنے اداروں کا احتساب نہیں کرتیں، وقت ان کا احتساب کرتا ہے۔

اس لیے آج ضرورت اس امر کی نہیں کہ ایک دوسرے پر الزامات لگائے جائیں، بلکہ اس بات کی ہے کہ اصل تاریخی ریکارڈ سامنے لایا جائے۔ 1960، 1964 اور 1970 کے وہ قانونی انتظامات عوام کے سامنے رکھے جائیں جن کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ پھر کھلے ذہن کے ساتھ یہ دیکھا جائے کہ موجودہ نظام عدل، مساوات اور حقیقی نمائندگی کے اصولوں پر کس حد تک پورا اترتا ہے۔

کیونکہ کسی نظام کا جواز صرف اس کے پرانے ہونے میں نہیں ہوتا، بلکہ اس کے عادلانہ ہونے میں ہوتا ہے۔ اور جب کسی قانون کے بارے میں سنجیدہ سوالات پیدا ہو جائیں تو ان کا جواب خاموشی نہیں بلکہ دلیل ہونی چاہیے۔

عدل ہی ہر سیاسی نظام کی اصل بنیاد ہے، اور جس نظام کی بنیاد عدل پر ہو، وہ سوالات سے نہیں ڈرتا۔

اس بحث میں داخل ہونے سے پہلے ایک بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ میرا اپنا خاندان بھی اُن لاکھوں کشمیری خاندانوں میں شامل ہے جنہوں نے 1947ء کے پُرآشوب حالات میں جموں و کشمیر سے ہجرت کی۔

ہمارے عزیز و اقارب آج آزاد کشمیر، پنجاب، کراچی اور اسلام آباد سمیت مختلف علاقوں میں آباد ہیں۔ لہٰذا یہ گفتگو نہ مہاجرینِ کشمیر کے خلاف ہے اور نہ ان کی قربانیوں کے انکار کے لیے۔ سوال صرف ایک اصول کا ہے، اور اصول ہمیشہ اشخاص اور جماعتوں سے بلند ہوتے ہیں۔

ہر سیاسی نظام کی صحت کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ عدل کے کس معیار پر قائم ہے۔ اسلام میں اقتدار کوئی اعزاز نہیں بلکہ امانت ہے، اور امانت کا تقاضا یہ ہے کہ معاملات ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوں جو ان کے نتائج کے سامنے جواب دہ ہوں۔

آزاد کشمیر کی مہاجر نشستوں کے بارے میں آج جو بحث جاری ہے، اسے بھی اسی اصول کی روشنی میں دیکھا جانا چاہیے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کی تقسیم اور اس کے بعد کے حالات میں لاکھوں افراد اپنے گھروں سے بے دخل ہوئے۔ ان کے دکھ، قربانیاں اور مسئلۂ کشمیر سے وابستگی کسی دلیل کے محتاج نہیں۔ لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ سیاسی نظام صرف جذبات پر نہیں بلکہ اصولوں پر قائم ہوتے ہیں۔

دستیاب تاریخی ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاجر نمائندگی کا تصور 1974ء کے عبوری آئین سے پہلے بھی کسی نہ کسی صورت موجود تھا۔

آزاد کشمیر کی سپریم کورٹ نے اپنے حالیہ فیصلے میں 1960، 1964 اور 1970 کے قانونی انتظامات کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن آج تک عوام کے سامنے یہ سوال پوری وضاحت سے نہیں آ سکا کہ آخر وہ کون سے قوانین، قواعد یا صدارتی آرڈرز تھے جنہوں نے اس نمائندگی کی بنیاد رکھی اور بعد ازاں اسے موجودہ شکل تک پہنچایا۔

یہ سوال اس لیے اہم ہے کہ کسی بھی آئینی بندوبست کی اصل بنیاد اس کی تاریخی اور قانونی حیثیت ہوتی ہے، نہ کہ اس کے حق یا مخالفت میں لگائے جانے والے نعرے۔

البتہ یہ بات واضح ہے کہ 1974ء کے عبوری آئین نے مہاجر نشستوں کو آزاد کشمیر کے موجودہ پارلیمانی ڈھانچے کا حصہ بنا دیا۔ سوال یہ ہے کہ نصف صدی گزر جانے کے بعد کیا اس بندوبست کا ازسرِ نو جائزہ لینا ممنوع ہے؟ کیا ہر وہ قانون جو ایک زمانے میں کسی خاص ضرورت کے تحت بنایا گیا ہو، ہمیشہ کے لیے ناقابلِ سوال قرار دیا جا سکتا ہے؟

جمہوریت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہوں۔ لیکن یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے: عوام سے مراد کون لوگ ہیں؟ کیا وہ جو کسی خطے میں رہتے ہیں، اس کے وسائل استعمال کرتے ہیں، اس کے نظمِ حکومت کے نتائج بھگتتے ہیں اور اس کے مستقبل سے براہِ راست وابستہ ہیں؟ یا وہ بھی جو کئی نسلوں سے اس خطے سے باہر آباد ہیں؟

یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب محض جذبات سے نہیں دیا جا سکتا۔

مہاجر نشستوں کے حامی یہ کہتے ہیں کہ چونکہ مسئلۂ کشمیر ابھی حل طلب ہے، اس لیے مہاجرینِ کشمیر کو سیاسی نمائندگی سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک قابلِ غور مؤقف ہے۔ لیکن اگر یہ دلیل درست ہے تو پھر اس پر بھی غور ہونا چاہیے کہ نمائندگی کی موجودہ شکل ہی کیوں برقرار رہے؟ کیا کوئی ایسا نظام ممکن نہیں جو ایک طرف مہاجرین کے تاریخی تعلق کو تسلیم کرے اور دوسری طرف مقامی آبادی کے حقِ نمائندگی اور جمہوری مساوات کو بھی متاثر نہ کرے؟

بدقسمتی سے ہمارے ہاں اکثر آئینی سوالات کو حب الوطنی اور غداری کے پیمانوں سے ناپا جاتا ہے۔ حالانکہ کسی قانون یا آئینی بندوبست پر سوال اٹھانا بغاوت نہیں بلکہ اصلاح کا پہلا قدم ہے۔ جو قومیں اپنے اداروں کا احتساب نہیں کرتیں، وقت ان کا احتساب کرتا ہے۔

اس لیے آج ضرورت اس امر کی نہیں کہ ایک دوسرے پر الزامات لگائے جائیں، بلکہ اس بات کی ہے کہ اصل تاریخی ریکارڈ سامنے لایا جائے۔

1960، 1964 اور 1970 کے وہ قانونی انتظامات عوام کے سامنے رکھے جائیں جن کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ پھر کھلے ذہن کے ساتھ یہ دیکھا جائے کہ موجودہ نظام عدل، مساوات اور حقیقی نمائندگی کے اصولوں پر کس حد تک پورا اترتا ہے۔

کیونکہ کسی نظام کا جواز صرف اس کے پرانے ہونے میں نہیں ہوتا، بلکہ اس کے عادلانہ ہونے میں ہوتا ہے۔ اور جب کسی قانون کے بارے میں سنجیدہ سوالات پیدا ہو جائیں تو ان کا جواب خاموشی نہیں بلکہ دلیل ہونی چاہیے۔

عدل ہی ہر سیاسی نظام کی اصل بنیاد ہے، اور جس نظام کی بنیاد عدل پر ہو، وہ سوالات سے نہیں ڈرتا۔

باب ششم

مہاجرینِ جموں وکشمیر کی نمائندگی: حق، عدل اور ریاستی وحدت کا تقاضا

جب کسی قوم پر آزمائش آتی ہے تو اس کا اصل امتحان یہ نہیں ہوتا کہ اس نے کتنی قربانیاں دیں، بلکہ یہ ہوتا ہے کہ قربانیوں کے بعد وہ انصاف کے کس معیار پر قائم رہی۔ قرآن مجید کا اٹل اصول ہے:

«"إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ"
"بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔" (النحل: 90)»

اور ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

«"وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ"
"کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف چھوڑ دو۔ انصاف کرو، یہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔" (المائدہ: 8)»

یہی وہ میزان ہے جس پر مہاجرینِ جموں کی نمائندگی کے مسئلے کو پرکھا جانا چاہیے، نہ کہ وقتی سیاسی مفادات، علاقائی تعصبات یا جذباتی نعروں کی بنیاد پر۔

آزاد جموں و کشمیر محض ایک انتظامی اکائی نہیں بلکہ پوری ریاست جموں و کشمیر کی علامت اور نمائندہ اکائی ہے۔ اس ریاست میں وادیٔ کشمیر، جموں، پونچھ، راجوری اور گلگت بلتستان سمیت تمام تاریخی خطے برابر کے شریک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد کشمیر کے آئینی ڈھانچے میں مہاجرینِ جموں کی نمائندگی کسی سیاسی رعایت کے طور پر نہیں بلکہ ریاستی وحدت اور تاریخی تسلسل کے اظہار کے طور پر موجود ہے۔ اگر اس بنیادی حقیقت کو نظرانداز کر دیا جائے تو ریاست کے نظریاتی، تاریخی اور آئینی وجود پر سوالیہ نشان کھڑا ہو جاتا ہے۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ 1947ء میں جموں کے مسلمانوں پر تاریخ کے بدترین مظالم ڈھائے گئے۔ لاکھوں انسان شہید ہوئے، بستیاں اجڑ گئیں، خاندان بکھر گئے اور لاکھوں افراد اپنے آبائی وطن سے ہجرت پر مجبور ہوئے۔ اس کے بعد 1965ء، 1971ء اور آنے والے ادوار میں بھی مسئلۂ کشمیر نے قربانیوں کی نئی داستانیں رقم کیں۔ ان شہداء کا خون بھی اسی ریاست کی آزادی، شناخت اور مستقبل کے لیے بہا جس کی نمائندگی آج آزاد جموں و کشمیر کرتا ہے۔

کیا انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جن لوگوں کو اپنے وطن سے بے دخل کر دیا گیا، انہی کی بے وطنی کو ان کے حق کے خاتمے کی دلیل بنا دیا جائے؟ کیا ظلم کا شکار ہونے والے کو مزید سزا دینا عدل کہلا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ انصاف نہیں بلکہ مظلوم کو دوہری سزا دینے کے مترادف ہے۔

افسوس کا مقام یہ ہے کہ جب بھی آزاد کشمیر میں کرپشن، بے ضابطگی، سیاسی وفاداریوں کی خرید و فروخت، لوٹا کریسی یا حکومتوں کی تبدیلی کا ذکر ہوتا ہے تو تنقید کا رخ صرف مہاجرینِ جموں کی بارہ نشستوں کی طرف موڑ دیا جاتا ہے، گویا تمام خرابیوں کی جڑ یہی نشستیں ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حکومتوں کی تشکیل اور تبدیلی میں مختلف علاقوں سے منتخب نمائندے برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ اگر سیاسی وفاداریاں تبدیل کرنا، ضمیر فروشی اور لوٹا کریسی قابلِ مذمت ہیں تو پھر احتساب بھی سب کا ہونا چاہیے۔ انصاف کبھی دو معیار قبول نہیں کرتا۔

اگر انتخابی نظام میں خامیاں ہیں تو پورے نظام کی اصلاح کیجیے۔ اگر حلقہ بندیوں میں عدم توازن ہے تو اس پر اصولی بحث کیجیے۔ اگر دھاندلی ہے تو ہر سطح پر اس کا خاتمہ کیجیے۔ لیکن اصلاحات کے نام پر صرف مہاجرینِ جموں کی نمائندگی ختم کرنے یا محدود کرنے کا مطالبہ انصاف، آئین، تاریخ اور ریاستی مفاد، چاروں کے خلاف ہے۔

یہ بھی یاد رکھیے کہ مسئلۂ جموں و کشمیر ابھی حل طلب ہے۔ پاکستان کا مسلسل مؤقف رہا ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کے تمام باشندوں کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق اپنے مستقبل کے تعین کا حق حاصل ہے۔ اگر آج ہم خود ہی ریاست کے ایک بڑے طبقے کو اس کی ریاستی شناخت اور آئینی نمائندگی سے محروم کرنے لگیں تو دنیا کے سامنے حقِ خودارادیت کا مطالبہ کس اخلاقی بنیاد پر کریں گے؟

یہ سوال صرف بارہ نشستوں کا نہیں بلکہ اصول کا ہے۔ آج اگر مہاجرینِ جموں کا حق چھینا جا سکتا ہے تو کل کسی اور طبقے کے حق پر بھی سوال اٹھایا جا سکتا ہے۔ جب اصول ٹوٹ جاتے ہیں تو پھر کسی حق کی ضمانت باقی نہیں رہتی۔

ریاست جموں و کشمیر ایک جسم کی مانند ہے۔ اس کے مختلف خطے اس کے مختلف اعضا ہیں۔ کوئی عضو دوسرے سے کم اہم نہیں۔ جو شخص ایک عضو کو کمزور کرتا ہے، وہ درحقیقت پورے جسم کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اسی طرح جو شخص مہاجرینِ جموں کے آئینی حق کو کمزور کرتا ہے، وہ دراصل ریاست کی وحدت، تاریخی تسلسل اور قومی مقدمے کو کمزور کرتا ہے۔

اصل معرکہ بارہ نشستوں کا نہیں بلکہ انصاف اور ناانصافی کا ہے؛ اصول اور مفاد کا ہے؛ تاریخ سے وفاداری اور تاریخ سے بے وفائی کا ہے۔

اگر ہم واقعی مسئلۂ کشمیر کے امین ہیں تو ہمیں اپنے شہداء کی قربانیوں، اپنے مہاجرین کے حقوق اور اپنے آئینی اصولوں کی حفاظت کرنا ہوگی۔ عدل ہی وہ بنیاد ہے جس پر قومیں قائم رہتی ہیں، اور ظلم وہ زہر ہے جو قوموں کو اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم علاقائی تعصبات سے بلند ہو کر یہ تسلیم کریں کہ ریاست جموں و کشمیر ایک ناقابلِ تقسیم تاریخی وحدت ہے۔ اس کے شہداء ایک ہیں، اس کی قربانیاں ایک ہیں، اس کے مہاجر ایک ہیں اور ان کے حقوق بھی ایک ہیں۔ کسی بھی خطے کے باشندوں کے حقوق اور پاکستان میں مقیم مہاجرینِ جموں و کشمیر کے حقوق میں کوئی تضاد نہیں، بلکہ دونوں ایک ہی قومی مقدمے کے دو لازم و ملزوم پہلو ہیں۔

قرآن ہمیں عدل کا حکم دیتا ہے، تاریخ ہمیں قربانیوں کی یاد دلاتی ہے، آئین ہمیں مساوات کا سبق دیتا ہے اور مسئلۂ کشمیر کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ریاست کے ہر باشندے کے حق کو بلاامتیاز تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ تاریخ کا فیصلہ طاقت نہیں کرتی، عدل کرتا ہے۔ اور جو قومیں عدل پر قائم رہتی ہیں، انہیں مٹانے والی طاقتیں خود تاریخ کے ملبے تلے دفن ہو جاتی ہیں۔

باب ہفتم

ایک ذاتی مگر اصولی موقف

میرا تعلق آزاد جموں و کشمیر سے ہے۔ میری پیدائش، پرورش اور شناخت اسی سرزمین سے وابستہ ہے، جبکہ میرے اجداد ریاست جموں و کشمیر کے اُس حصے سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے جہاں 1947ء کے المناک واقعات نے لاکھوں انسانوں کو اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور کیا۔ اس لیے میرے لیے یہ بحث کسی ایک فریق کی حمایت یا مخالفت کا نہیں بلکہ اپنی پوری ریاست کے آئینی، تاریخی اور اخلاقی حق کا سوال ہے۔

میں عوامی حقوق، کرپشن کے خاتمے، لوٹا کریسی کے خلاف جدوجہد اور آزاد کشمیر میں مضبوط جمہوری نظام کا ہمیشہ حامی رہا ہوں۔ اسی طرح میں عوامی ایکشن کمیٹی کی عوامی حقوق کی تحریک اور اس کے جائز مطالبات کی بھی حمایت کرتا ہوں۔ عوام کو سستی بجلی، آٹے سمیت بنیادی ضروریات، شفاف حکمرانی اور باوقار زندگی کا حق ملنا چاہیے، اور ان حقوق کے لیے پرامن جدوجہد ہر شہری کا آئینی و جمہوری حق ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ایک اصولی سوال بھی اپنی جگہ موجود ہے۔ کیا چند افراد کے غلط کردار کی سزا لاکھوں مہاجرین کے آئینی حق کو دی جا سکتی ہے؟ اگر چند نمائندے غلط ہیں تو ان کا احتساب کیجیے، قانون بدلیے، انتخابی اصلاحات لائیے، مگر کسی طبقے کے تاریخی اور آئینی حق کو ختم کرنے کی بات انصاف کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ حکومتیں صرف بارہ نشستوں سے نہیں بنتیں اور نہ ہی صرف انہی کی وجہ سے گرتی ہیں۔ آزاد کشمیر کی سیاسی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ مختلف نشستوں سے منتخب ہونے والے ارکان نے بھی بارہا سیاسی وفاداریاں تبدیل کیں، حکومتیں بنائیں اور گرائیں۔ اگر اصل مسئلہ اسٹیبلشمنٹ کی مداخلت، ضمیر فروشی اور سیاسی تجارت ہے تو نشانہ بھی وہی ہونا چاہیے، نہ کہ صرف ایک مخصوص طبقہ۔

مجھے افسوس اس بات پر ہے کہ اس بحث میں بعض اوقات مہاجرین اور مقامی آبادی کو ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا جاتا ہے، حالانکہ دونوں ایک ہی ریاست کے وارث ہیں۔ جموں کے مہاجرین کی قربانیاں بھی اسی تاریخ کا حصہ ہیں اور آزاد کشمیر کے عوام کی جدوجہد بھی اسی تاریخ کا تسلسل ہے۔ ان دونوں کو آمنے سامنے کھڑا کرنا دراصل اس وحدت کو کمزور کرتا ہے جس پر مسئلۂ کشمیر کا مقدمہ قائم ہے۔

میرا یقین ہے کہ ہم سب کے شہداء مشترک ہیں، ہماری تاریخ مشترک ہے، ہمارا مقدمہ مشترک ہے اور ہمارا مستقبل بھی مشترک ہونا چاہیے۔ اختلاف رائے ہر معاشرے میں ہوتا ہے، مگر اختلاف کی بنیاد اصول، آئین اور دلیل ہونی چاہیے، نہ کہ ایک دوسرے کی نیت، شناخت یا قربانیوں پر سوال اٹھانا۔

میرا مؤقف نہ کسی شخصیت کے دفاع کے لیے ہے، نہ کسی جماعت کے لیے اور نہ کسی حکومت کے لیے۔ میں عوامی ایکشن کمیٹی کی تحریک کے خلاف نہیں، بلکہ ہر اس تجویز کے خلاف ہوں جو کسی طبقے کے آئینی اور تاریخی حق کو متاثر کرے۔ اصلاح ضرور ہونی چاہیے، احتساب ضرور ہونا چاہیے، مگر انصاف کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ کیونکہ جب انصاف کمزور ہوتا ہے تو آخرکار سب کے حقوق کمزور ہو جاتے ہیں۔

باب ہشتم

آزاد کشمیر: بحران کا حل طاقت نہیں، عدل، آئین اور مذاکرات ہیں

آزاد جموں و کشمیر اس وقت اپنی تاریخ کے ایک نہایت نازک مرحلے سے گزر رہا ہے۔ گزشتہ تین ہفتوں سے جاری کشیدگی نے نہ صرف عوام کی روزمرہ زندگی کو مفلوج کر دیا ہے بلکہ تجارت، نقل و حمل، تعلیم، صحت اور بنیادی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کو بھی شدید متاثر کیا ہے۔ ایسے حالات میں ریاست کی ذمہ داری یہ نہیں کہ وہ طاقت کے ذریعے خاموشی مسلط کرے، بلکہ یہ ہے کہ وہ انصاف، آئین اور عوامی اعتماد کی بنیاد پر بحران کا حل تلاش کرے، کیونکہ ریاست کی اصل قوت اس کے ہتھیار نہیں بلکہ اس کے عوام کا اعتماد ہوتا ہے۔

یہ بحران کسی ایک دن یا ایک واقعے کا نتیجہ نہیں۔ مئی 2023 میں تاجروں، ٹرانسپورٹرز، وکلاء، طلبہ اور دیگر شہری طبقات نے بڑھتے ہوئے عوامی، معاشی اور انتظامی مسائل کے حل کے لیے جوائنٹ عوامی ایکشن کمیٹی قائم کی۔ ابتدا ہی سے اس تحریک نے اپنے مطالبات کو عوامی مسائل تک محدود رکھا، جن میں آٹے پر سبسڈی، بجلی کے نرخوں میں کمی، ظالمانہ ٹیکسوں کا خاتمہ، مہنگائی پر قابو، قدرتی وسائل پر عوام کے حق اور بنیادی سہولیات کی فراہمی جیسے نکات شامل تھے۔

اس کے بعد حکومت اور جوائنٹ عوامی ایکشن کمیٹی کے درمیان متعدد ادوار مذاکرات ہوئے۔ مئی 2024 کی ریاست گیر تحریک کے بعد حکومت نے مذاکرات کے ذریعے کئی بنیادی مطالبات تسلیم کیے اور تحریری معاہدہ طے پایا۔ بعد ازاں 8 دسمبر 2024 کو ایک اور معاہدہ ہوا، جبکہ 4 اکتوبر 2025 کو حکومت اور جوائنٹ عوامی ایکشن کمیٹی کے درمیان 38 نکاتی چارٹر پر بھی اتفاق کیا گیا۔ مگر افسوس کہ ان معاہدوں پر مکمل اور بروقت عمل درآمد نہ ہو سکا۔ نتیجتاً عوام میں مایوسی بڑھتی گئی اور تحریک ایک مرتبہ پھر شدت اختیار کر گئی۔

یہاں وہ بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے جس کا جواب حکومت کو قوم کے سامنے دینا چاہیے۔ اگر یہی جوائنٹ عوامی ایکشن کمیٹی گزشتہ تین برس سے حکومت کے ساتھ مذاکرات کرنے والی، معاہدوں پر دستخط کرنے والی اور عوام کی نمائندہ حیثیت سے تسلیم شدہ جماعت تھی، تو پھر اچانک اسے کالعدم قرار دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اگر کل تک مذاکرات کی میز پر بیٹھنے والے آج ریاست دشمن یا غدار قرار دیے جا رہے ہیں تو اس تبدیلی کی آئینی، قانونی اور اخلاقی بنیاد کیا ہے؟

موجودہ بحران میں ایک اور تشویشناک پہلو یہ ہے کہ جوائنٹ عوامی ایکشن کمیٹی پر پابندی عائد کی گئی، اس سے وابستہ افراد کے خلاف غداری سمیت سنگین مقدمات قائم کیے گئے اور متعدد کارکن اور رہنما گرفتار کیے گئے۔ اختلافِ رائے کو ریاست دشمنی سے تعبیر کرنا نہ جمہوری اصولوں سے مطابقت رکھتا ہے اور نہ آئینی روایات سے۔ اگر حکومت واقعی مذاکرات کے ذریعے مسئلے کا حل چاہتی ہے تو اعتماد سازی کے لیے ایسے اقدامات پر فوری نظرثانی ناگزیر ہے، کیونکہ مذاکرات کی کامیابی تصادم نہیں بلکہ اعتماد کی فضا میں ہوتی ہے۔

اس بحران کا سب سے المناک اور دل خراش پہلو انسانی جانوں کا ضیاع ہے۔ ریاست کی بنیادی ذمہ داری شہریوں کے جان و مال کا تحفظ ہے، اس لیے حالیہ کارروائیوں کے نتیجے میں پندرہ سے زائد شہری جان بحق ہوئے ہیں تو یہ ایک ایسا معاملہ ہے جسے محض انتظامی کارروائی قرار دے کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی آزاد، شفاف اور غیر جانبدارانہ تحقیقات ناگزیر ہیں تاکہ حقائق قوم کے سامنے آئیں، ذمہ داروں کا تعین ہو اور متاثرہ خاندانوں کو انصاف مل سکے۔ مزید برآں، یہ کہ بعض متوفین کی میتیں تاحال ان کے ورثاء کے حوالے نہیں کی گئیں تو یہ نہ صرف انسانی اور اخلاقی اقدار بلکہ اسلامی تعلیمات اور قانونی تقاضوں سے بھی متصادم ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ تمام میتیں بلا تاخیر ان کے ورثاء کے سپرد کرے تاکہ وہ اپنے مذہبی فرائض اور معاشرتی روایات کے مطابق تدفین اور سوگ کے مراحل مکمل کر سکیں۔ ریاست کی اخلاقی عظمت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ زندہ انسانوں کے حقوق کے ساتھ ساتھ وفات پانے والوں کے وقار اور ان کے اہلِ خانہ کے جذبات کا بھی مکمل احترام کرے۔

اس بحران نے صرف سیاسی ماحول کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ عام آدمی کی زندگی کو بھی شدید مشکلات سے دوچار کر دیا ہے۔ گزشتہ تین ہفتوں کے دوران سڑکوں کی بندش کے باعث پھل، سبزیاں اور دیگر جلد خراب ہونے والی اشیائے خوردونوش تباہ ہو گئیں، تاجروں کا کروڑوں روپے کا سرمایہ ضائع ہو گیا، ٹرانسپورٹرز کی گاڑیاں کھڑی رہیں، مزدور دیہاڑی سے محروم ہو گئے، طلبہ کی تعلیم متاثر ہوئی اور مریضوں تک ادویات کی بروقت رسائی بھی مشکل ہو گئی۔ ریاست کا فرض ہے کہ وہ ان نقصانات کا شفاف تخمینہ لگائے، متاثرہ تاجروں، ٹرانسپورٹرز اور شہریوں کے لیے مالی تلافی اور بحالی کا مؤثر نظام وضع کرے اور بنیادی اشیائے ضروریہ کی بلا تعطل فراہمی کو یقینی بنائے۔

ان تمام تلخ حالات کے باوجود امید کی ایک کرن اس وقت پیدا ہوئی جب جوائنٹ عوامی ایکشن کمیٹی نے جماعت اسلامی پاکستان اور امیر جماعت اسلامی حافظ نعیم الرحمن کو ثالثی کا کردار ادا کرنے کی دعوت دی۔ یہ پیشکش نہایت خوش آئند ہے، کیونکہ قومی بحرانوں کا حل محاذ آرائی، انتقام اور طاقت کے استعمال میں نہیں بلکہ دیانت دار ثالثی، اعتماد سازی اور بامقصد مذاکرات میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ جماعت اسلامی کا صدرِ پاکستان، وزیراعظم پاکستان اور دیگر قومی قیادت سے رابطے کر کے اس بحران کے پرامن حل کے لیے کردار ادا کرنے کا فیصلہ ایک مثبت پیش رفت ہے، جس سے امید بندھتی ہے کہ حالات کو مزید بگاڑنے کے بجائے افہام و تفہیم کا راستہ اختیار کیا جائے گا۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت فوری طور پر اعتماد سازی کے اقدامات کرے، جوائنٹ عوامی ایکشن کمیٹی پر عائد پابندی واپس لے، سیاسی بنیادوں پر قائم مقدمات کا ازسرنو جائزہ لے، گرفتار افراد کو قانون کے مطابق انصاف فراہم کرے، سابقہ معاہدوں پر مکمل عمل درآمد یقینی بنائے، بنیادی اشیائے ضروریہ کی ترسیل بحال کرے، متاثرہ تاجروں اور ٹرانسپورٹرز کے نقصانات کی تلافی کرے اور تمام متعلقہ فریقوں کے ساتھ سنجیدہ اور نتیجہ خیز مذاکرات کا آغاز کرے۔

تاریخ گواہ ہے کہ طاقت وقتی خاموشی تو پیدا کر سکتی ہے، مگر پائیدار امن صرف انصاف، آئینی بالادستی، وعدوں کی پاسداری اور عوام کے اعتماد سے قائم ہوتا ہے۔ آزاد کشمیر کا موجودہ بحران بھی اسی اصول کے تحت حل ہو سکتا ہے۔ اگر ریاست نے اس موقع پر عدل، حکمت اور مکالمے کا راستہ اختیار کیا تو نہ صرف موجودہ کشیدگی ختم ہوگی بلکہ عوام اور ریاست کے درمیان اعتماد کا وہ رشتہ بھی مضبوط ہوگا جو ہر مستحکم اور مہذب معاشرے کی اصل بنیاد ہے۔

باب نہم

جب ریاست اور رعایا آمنے سامنے ہوں — ایک لمحۂ فکریہ

"جو میری آنکھوں نے دیکھا لوگو، تمہیں بتا دوں تو کیا کرو گے
جو سن رہے ہو وہ کچھ نہیں ہے، میں سب سنا دوں تو کیا کرو گے۔"
— عابی مکھنوی

یہ دو مصرعے محض ایک شاعر کے جذبات نہیں، بلکہ اس اجتماعی اضطراب کی ترجمانی ہیں جو اس وقت جنم لیتا ہے جب مظلوم خود کو تنہا محسوس کرے، جب اختلاف کو جرم بنا دیا جائے، اور جب انصاف کی امید کمزور پڑنے لگے۔

آزاد کشمیر کے موجودہ حالات کا جائزہ اگر جذبات سے بالاتر ہو کر لیا جائے تو ایک حقیقت روزِ روشن کی طرح سامنے آتی ہے کہ یہاں اصل مسئلہ صرف ایک دھرنا، ایک احتجاج یا ایک انتظامی بحران نہیں، بلکہ ریاست اور عوام کے درمیان اعتماد کا بحران ہے۔ جب حکومت اپنی ہی رعایا کی آواز کو سننے کے بجائے اسے محض امن و امان کا مسئلہ سمجھنے لگے، اور جب عوام ریاست کو اپنا محافظ نہیں بلکہ مخالف سمجھنے لگیں، تو دونوں فریق شکست کھاتے ہیں۔

اسلام میں حکومت کو اقتدار کا نہیں، امانت کا نام دیا گیا ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

«"إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا..."
"اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے سپرد کرو۔"
(سورۃ النساء: 58)»

اقتدار بھی ایک امانت ہے۔ اس کا مقصد رعایا کو خاموش کرنا نہیں بلکہ ان کے حقوق کی حفاظت کرنا ہے۔ ریاست اگر اپنے شہریوں کو خوف کے ذریعے مطیع بنانا چاہے تو وہ وقتی طور پر کامیاب ہو سکتی ہے، لیکن دلوں پر حکومت نہیں کر سکتی۔

یہ بھی اتنی ہی بڑی حقیقت ہے کہ احتجاج کرنے والوں کی ذمہ داری بھی صرف مطالبات پیش کرنا نہیں، بلکہ اخلاق، نظم اور قانون کی ایسی مثال قائم کرنا ہے کہ ان کی جدوجہد اپنی سچائی سے پہچانی جائے۔ اسلامی تاریخ میں حق کی جدوجہد ہمیشہ کردار کی بلندی کے ساتھ جڑی رہی ہے، محض جذبات کے اظہار کے ساتھ نہیں۔

آزاد کشمیر کے حالیہ واقعات نے ایک اور تلخ سوال پیدا کیا ہے۔ اگر شہری اپنی بنیادی ضروریات—خوراک، علاج، تعلیم اور روزگار—کے لیے بے یقینی کا شکار ہو جائیں، تو کیا یہ صرف ایک سیاسی تنازع رہ جاتا ہے؟ نہیں، یہ انسانی وقار کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ ریاست کا پہلا فرض یہی ہے کہ وہ عام انسان کی زندگی کو تحفظ دے، نہ کہ اسے مزید دشوار بنا دے۔

سید مودودی نے ایک موقع پر یہ تصور واضح کیا کہ ظلم صرف وہ نہیں جو کسی فرد پر ہو، بلکہ وہ نظام بھی ظلم ہے جو لوگوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم رکھے یا انصاف تک رسائی مشکل بنا دے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں عدل کو عبادت کی طرح اہمیت دی گئی ہے، کیونکہ عدل کے بغیر نہ ریاست مضبوط ہوتی ہے اور نہ قومیں۔

آج سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک دوسرے پر الزامات کی بارش بند کی جائے اور مسائل کی جڑ تک پہنچا جائے۔ اگر عوام مہنگائی، بجلی، روزگار، گورننس یا دیگر بنیادی معاملات پر سوال اٹھاتے ہیں تو ان سوالات کا جواب دلیل اور پالیسی سے دیا جانا چاہیے، نہ کہ صرف طاقت کے اظہار سے۔

اسی طرح اگر احتجاج کے دوران قانون شکنی یا تشدد کے واقعات ہوئے ہیں تو ان کی بھی غیر جانب دارانہ تحقیقات ہونی چاہییں۔ عدل کا تقاضا یہی ہے کہ نہ کسی بے گناہ کو مجرم بنایا جائے اور نہ کسی مجرم کو محض طاقت یا حیثیت کی بنا پر استثنا دیا جائے۔

یہ لمحہ اس بات کا بھی متقاضی ہے کہ اہلِ قلم، علماء، وکلاء، اساتذہ اور دانشور اپنی ذمہ داری ادا کریں۔ ان کا فرض صرف کسی ایک فریق کی تائید یا مخالفت نہیں، بلکہ حق کی شہادت دینا ہے۔ قرآن مجید اہلِ ایمان کو حکم دیتا ہے کہ انصاف پر مضبوطی سے قائم رہو، خواہ وہ فیصلہ خود اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

قوموں کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بحران ہمیشہ دو راستے کھولتے ہیں۔ ایک راستہ تصادم، انتقام اور مزید تقسیم کا ہوتا ہے، جبکہ دوسرا راستہ اصلاح، انصاف اور مفاہمت کا۔ دانش مند قومیں دوسرا راستہ اختیار کرتی ہیں، کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ طاقت سے حکومت کی جا سکتی ہے، لیکن دل صرف انصاف سے جیتے جاتے ہیں۔

آزاد کشمیر کا مستقبل بھی اسی اصول سے وابستہ ہے۔ اگر حکومت انصاف، شفافیت اور مکالمے کا راستہ اختیار کرے، اور اگر عوام اپنی جدوجہد کو امن، قانون اور اخلاق کے دائرے میں رکھیں، تو یہ بحران ایک نئے سماجی معاہدے کی بنیاد بن سکتا ہے۔ لیکن اگر دونوں جانب ضد غالب آ گئی تو نقصان کسی ایک جماعت یا حکومت کا نہیں، پوری قوم کا ہوگا۔

شاعر نے سوال کیا تھا:

"جو میری آنکھوں نے دیکھا لوگو، تمہیں بتا دوں تو کیا کرو گے؟"

آج اس سوال کا جواب صرف حکومت کو نہیں، عوام کو بھی دینا ہے۔ اگر سچ ہمارے سامنے آ جائے، اگر غلطیاں واضح ہو جائیں، اگر ظلم ثابت ہو جائے، تو کیا ہم انصاف کا ساتھ دیں گے؟ یا پھر اپنی سیاسی وابستگیوں، گروہی تعصبات اور وقتی مفادات کی خاطر خاموش رہیں گے؟

تاریخ کا سب سے سخت فیصلہ عدالتیں نہیں کرتیں، قوموں کا اجتماعی ضمیر کرتا ہے۔ اور جب ضمیر بیدار ہو جائے تو پھر ظلم زیادہ دیر زندہ نہیں رہتا۔

باب دہم

ایک پُرامن وادی سے خون آلود منظرنامے تک

آزاد جموں و کشمیر کبھی اس خطے کی پہچان امن، اخوت اور سماجی ہم آہنگی تھی۔ اختلافات بھی ہوتے تھے، سیاسی کشمکش بھی موجود تھی، مگر معاشرہ اس حد تک منتشر نہ تھا کہ خون رشتوں سے زیادہ ارزاں ہو جائے اور اختلاف، دشمنی میں بدل جائے۔ یہ وہ سرزمین تھی جہاں لوگوں کے درمیان سیاسی وابستگیاں مختلف ہو سکتی تھیں، مگر ایک دوسرے کی جان، عزت اور حرمت محفوظ سمجھی جاتی تھی۔

آج اگر ہم اسی سرزمین کی طرف دیکھیں تو دل بے اختیار یہ سوال کرتا ہے کہ آخر ایسا کیا ہوا کہ امن کی یہ وادی اضطراب کی علامت بن گئی؟ وہ کون سے فیصلے تھے، وہ کون سی پالیسیاں تھیں، وہ کون سی غلطیاں تھیں جنہوں نے ایک پُرسکون معاشرے کو کشیدگی، نفرت اور خونریزی کی طرف دھکیل دیا؟

یہ سوال کسی ایک جماعت، ایک حکومت یا ایک گروہ سے نہیں، بلکہ ان تمام لوگوں سے ہے جنہوں نے اقتدار، سیاست یا قوت کے استعمال میں اللہ کی مقرر کردہ حدود کو نظر انداز کیا۔ قرآن مجید کا اصول ہے کہ فساد کبھی یک دم پیدا نہیں ہوتا، بلکہ وہ انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔

«﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ﴾

"خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا، ان اعمال کی وجہ سے جو لوگوں کے ہاتھوں نے کمائے۔" (الروم: 41)»

یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ معاشروں پر آنے والے بحران محض حادثات نہیں ہوتے۔ وہ اجتماعی غلطیوں، ناانصافیوں، طاقت کے غلط استعمال، اور حق سے انحراف کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جب انصاف کمزور پڑ جائے، قانون کا احترام ختم ہونے لگے، اور اختلاف کو مکالمے کے بجائے طاقت سے دبانے کی کوشش کی جائے تو معاشرے رفتہ رفتہ امن کھو دیتے ہیں۔

اسلام کی تعلیم یہ نہیں کہ انسان صرف اپنے مخالف کے ظلم کو دیکھے اور اپنے پسندیدہ لوگوں کی غلطیوں پر خاموش رہے۔ قرآن مسلمانوں کو حکم دیتا ہے:

«﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ﴾

"اے ایمان والو! انصاف پر مضبوطی سے قائم رہو، اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنو، اگرچہ وہ گواہی خود تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔" (النساء: 135)»

یہی اسلامی عدل کا امتیاز ہے کہ وہ کسی جماعت، شخصیت یا مفاد کا اسیر نہیں ہوتا۔ وہ صرف حق کا تابع ہوتا ہے۔

آزاد کشمیر کے حالیہ حالات پر افسوس کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم کسی ایک فریق کو تمام تر ذمہ داری کا حامل قرار دے دیں یا دوسرے کو ہر خطا سے بری الذمہ سمجھ لیں۔ تاریخ کا انصاف اس سے کہیں زیادہ دیانت کا تقاضا کرتا ہے۔ جس نے جہاں ظلم کیا، قانون توڑا، نفرت کو ہوا دی، عوام کے جان و مال کو خطرے میں ڈالا یا سیاسی اختلاف کو انسانی دشمنی میں تبدیل کیا، وہ اپنے عمل کا جواب دہ ہے۔ ذمہ داری کی تقسیم حالات کے مطابق مختلف ہو سکتی ہے، مگر جواب دہی سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔

ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ دنیا کی عدالتیں کبھی مکمل انصاف نہیں کر سکتیں۔ بعض اوقات مجرم قانون سے بچ نکلتے ہیں اور مظلوم انصاف کی آس میں دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایک عدالت ایسی ہے جہاں نہ سفارش چلے گی، نہ طاقت، نہ منصب اور نہ اقتدار۔

قرآن مجید اعلان کرتا ہے:

«﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا﴾

"اور ہم قیامت کے دن انصاف کے ترازو قائم کریں گے، پھر کسی جان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں ہوگا۔" (الأنبياء: 47)»

وہاں مظلوم کی آہ گم نہیں ہوگی، بے گناہ کا خون رائیگاں نہیں جائے گا، اور اقتدار کے ایوانوں میں کیے گئے فیصلے بھی اسی طرح تولے جائیں گے جیسے گلیوں اور بازاروں میں کیے گئے اعمال۔

یہ احساس ہر صاحبِ اختیار کے دل میں زندہ رہنا چاہیے کہ حکومت ایک امانت ہے، طاقت ایک امتحان ہے، اور اختیار ایک جواب دہی۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ دنیا کی طاقت اسے ہمیشہ بچا لے گی، وہ تاریخ بھی نہیں جانتا اور آخرت پر بھی غور نہیں کرتا۔

آج آزاد کشمیر کو سب سے زیادہ ضرورت کسی نئے نعرے کی نہیں، بلکہ سچ بولنے کے حوصلے، انصاف قائم کرنے کے عزم، قانون کی بالادستی، برداشت، مکالمے اور اجتماعی احتساب کی ہے۔ نفرت کا جواب نفرت نہیں، عدل ہے؛ تشدد کا جواب مزید تشدد نہیں، قانون ہے؛ اور بحران کا حل الزام تراشی نہیں بلکہ حقائق کا بے لاگ اعتراف ہے۔

ہماری دعا کسی ایک فریق کے لیے نہیں، بلکہ پوری سرزمین کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ اس دھرتی کو دوبارہ امن کا گہوارہ بنائے، اہلِ اقتدار کو عدل کی توفیق دے، اہلِ سیاست کو دیانت عطا فرمائے، اور عوام کو ایسی بصیرت نصیب کرے کہ وہ شخصیتوں کے بجائے اصولوں کو معیار بنائیں۔

اور اگر کسی نے اس سرزمین کے امن کو دانستہ مجروح کیا، انسانوں کے خون کو ارزاں سمجھا، یا اپنے مفادات کے لیے نفرت کی آگ بھڑکائی، تو وہ یہ نہ بھولے کہ دنیا کی عدالت سے بچ نکلنا ممکن ہو سکتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی عدالت سے نہیں، جہاں نہ کوئی منصب کام آئے گا، نہ کوئی جماعت، نہ کوئی طاقت، بلکہ صرف حق، عدل اور اعمال کا وزن فیصلہ کرے گا۔

باب یازدہم

تاریخ کا آئینہ اور آزاد کشمیر: سقوطِ ڈھاکہ کے اسباق، ریاستی حکمتِ عملی اور عوامی اعتماد

«"فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ"
"پس اے اہلِ بصیرت! عبرت حاصل کرو۔" (سورۃ الحشر: 2)»

قوموں کی تاریخ میں بعض سانحات ایسے ہوتے ہیں جو محض ایک نسل کے لیے نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی مستقل تنبیہ بن جاتے ہیں۔ 16 دسمبر 1971 کا سانحۂ سقوطِ مشرقی پاکستان بھی اسی نوعیت کا ایک واقعہ ہے۔ اگر اسے صرف ایک فوجی شکست کے طور پر دیکھا جائے تو یہ تاریخ کے ساتھ ناانصافی ہوگی، کیونکہ اس کے اسباب سیاسی، آئینی، اخلاقی، انتظامی اور عسکری، تمام پہلوؤں پر محیط تھے۔

اس حقیقت کا اعتراف صرف سیاسی مخالفین نے نہیں کیا، بلکہ پاکستان کے اپنے ججوں، فوجی افسران اور اہلِ فکر نے بھی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بریگیڈیئر صدیق سالک، خرم مراد، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور حمود الرحمٰن کمیشن، اگرچہ مختلف زاویوں سے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہیں، لیکن ایک بنیادی نکتے پر تقریباً متفق نظر آتے ہیں: ریاست کی اصل قوت عوام کا اعتماد اور انصاف ہے، محض طاقت نہیں۔

سقوطِ ڈھاکہ: ایک فوجی شکست یا قومی ناکامی؟

26 دسمبر 1971 کو اس وقت کے صدر ذوالفقار علی بھٹو نے ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کیا، جس کی سربراہی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس حمود الرحمٰن کے سپرد کی گئی۔ کمیشن نے پہلے مرحلے میں 213 گواہوں کے بیانات قلم بند کیے، اور بعد ازاں جنگی قیدیوں اور دیگر متعلقہ افراد کے بیانات شامل کر کے ایک ضمنی رپورٹ بھی مرتب کی۔

حمود الرحمٰن کمیشن نے واضح کیا کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کو صرف عسکری ناکامی قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ اس میں سیاسی غلط فیصلے، انتظامی کمزوریاں، قیادت کی ناکامیاں، اخلاقی انحطاط اور حقیقت پسندانہ فیصلوں کے فقدان جیسے عوامل بھی شامل تھے۔ کمیشن نے سفارش کی کہ ذمہ داران کا احتساب کیا جائے اور ریاستی اداروں میں اصلاحات نافذ کی جائیں۔

یہی وہ نکتہ ہے جسے عوامی مباحث میں اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

صدیق سالک: جب ریاست اپنے ہی عوام سے حقیقت چھپا لے

بریگیڈیئر صدیق سالک نے اپنی معروف کتاب "میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا" میں بارہا اس ماحول کا ذکر کیا ہے جہاں سرکاری دعوے اور زمینی حقائق ایک دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ عوام کو مسلسل یہ باور کرایا جاتا رہا کہ حالات قابو میں ہیں، جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔

صدیق سالک کا بنیادی پیغام یہی ہے کہ پروپیگنڈا کبھی حقیقت کا متبادل نہیں بن سکتا۔ اگر ریاست اپنے عوام سے سچ بولنا چھوڑ دے تو اعتماد مجروح ہوتا ہے، اور جب اعتماد ٹوٹ جائے تو ریاست کی بنیادیں بھی کمزور پڑنے لگتی ہیں۔

خرم مراد: سقوطِ ڈھاکہ ایک اخلاقی بحران

خرم مراد نے اپنی کتاب "لمحات" کے آخری باب میں سقوطِ مشرقی پاکستان کو ایک اخلاقی بحران قرار دیا۔ ان کے نزدیک قومیں صرف اسلحے کی کمی سے نہیں، بلکہ کردار، دیانت، انصاف اور قیادت کے بحران سے بھی شکست کھاتی ہیں۔

ان کا استدلال یہ تھا کہ اگر ریاست اپنے ہی شہریوں کو مخالف سمجھنے لگے اور ان کے تحفظات سننے کے بجائے طاقت کو واحد حل قرار دے دے، تو وقتی خاموشی تو پیدا ہو سکتی ہے، لیکن دیرپا استحکام ممکن نہیں رہتا۔

سید مودودیؒ کی تنبیہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد اپنی تقاریر، بیانات اور "تصریحات" میں بار بار اس بات پر زور دیا کہ اسلامی ریاست کی بنیاد جبر نہیں بلکہ عدل، شورائیت، دیانت اور جواب دہی ہے۔

انہوں نے اس سانحے کو صرف بیرونی سازشوں کا نتیجہ قرار نہیں دیا، بلکہ اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی کہ داخلی ناانصافیاں، سیاسی حقوق سے انحراف، آئینی راستوں کو ترک کرنا اور عوامی اعتماد کو مجروح کرنا کسی بھی ریاست کو کمزور کر دیتا ہے۔ ان کے نزدیک بیرونی دشمن ہمیشہ داخلی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتا ہے؛ اس لیے اصل علاج قومی احتساب، انصاف اور اصلاح ہے، نہ کہ محض طاقت کا اظہار۔

(مراجع: تصریحات، جلد دوم؛ ترجمان القرآن، 1971–72 کے اداریے اور بیانات)

آزاد کشمیر: تاریخ کو دہرانا نہیں، اس سے سیکھنا

آزاد کشمیر کی آئینی اور بین الاقوامی حیثیت پاکستان کے دیگر صوبوں سے مختلف ہے۔ اسی لیے یہاں ہر حکمتِ عملی کو غیر معمولی سیاسی بصیرت اور عوامی اعتماد کے ساتھ ترتیب دینا ضروری ہے۔

اگر عوام اپنے بنیادی معاشی، سماجی یا انتظامی حقوق کے لیے پرامن انداز میں آواز بلند کریں، تو ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ مذاکرات، انصاف اور آئینی ذرائع کے ذریعے ان کے مسائل حل کرے۔ اگر حکومت بعض مطالبات تسلیم کر چکی ہو تو ان پر بروقت عمل درآمد بھی ریاستی ساکھ کا لازمی تقاضا ہے۔

یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ آج کے حالات بعینہٖ 1971 جیسے ہیں، تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ کے اصول آج بھی وہی ہیں۔ جہاں انصاف کمزور ہوگا، وہاں اعتماد کمزور ہوگا؛ اور جہاں اعتماد کمزور ہوگا، وہاں قومی یکجہتی بھی متاثر ہوگی۔

قومی سلامتی کا اصل مفہوم

قومی سلامتی صرف سرحدوں کے دفاع کا نام نہیں۔ ایک ریاست اس وقت مضبوط ہوتی ہے جب:

عوام کو انصاف میسر ہو۔

اختلافِ رائے کو دشمنی نہ سمجھا جائے۔

ادارے آئین کے دائرے میں رہ کر کام کریں۔

حکومت اپنے وعدوں کی پابند ہو۔

میڈیا کو حقائق بیان کرنے کی آزادی حاصل ہو۔

احتساب بلاامتیاز ہو۔

یہی وہ اصول ہیں جن کی طرف حمود الرحمٰن کمیشن، صدیق سالک، خرم مراد اور سید مودودیؒ مختلف انداز میں اشارہ کرتے ہیں۔

نتیجہ

سقوطِ ڈھاکہ تاریخ کا بند باب نہیں بلکہ ایک زندہ سبق ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ ہر احتجاج بغاوت ہے یا ہر اختلاف دشمنی، تاریخ کی غلط قرأت ہوگی۔ اسی طرح یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ہر موجودہ مسئلہ 1971 کی تکرار ہے۔

درست رویہ یہ ہے کہ ماضی سے وہ اصول اخذ کیے جائیں جو ہر دور میں قابلِ عمل رہتے ہیں: عدل، شفافیت، عوامی اعتماد، آئینی بالادستی، سیاسی مکالمہ اور جواب دہی۔

اگر پاکستان اور آزاد کشمیر کے ذمہ دار حلقے ان اصولوں کو اپنی حکمتِ عملی کا حصہ بنائیں تو تاریخ کا تلخ ترین باب مستقبل کی حفاظت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ لیکن اگر ماضی کے اسباق کو فراموش کر دیا گیا تو تاریخ پھر یہی سوال دہرائے گی کہ جب تنبیہ موجود تھی تو اصلاح کیوں نہ کی گئی؟

اہم مراجع:

1. بریگیڈیئر صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا۔
2. خرم مراد، لمحات، آخری باب۔
3. سید ابوالاعلیٰ مودودی، تصریحات (جلد دوم)، اور ترجمان القرآن (1971–1972 کے اداریے)۔
4. Hamoodur Rahman Commission Report (1972؛ Supplementary Report 1974)۔

حصہ سوم

پاکستان، ریاست اور جمہوری ارتقا

تعارفی نوٹ

پاکستان کی سیاسی تاریخ صرف حکومتوں کی تبدیلی کی تاریخ نہیں، بلکہ ریاستی اداروں، سیاسی جماعتوں، آئینی ارتقا، جمہوری جدوجہد اور سیاسی انجینئرنگ کے باہمی تعلق کی بھی تاریخ ہے۔ اس تاریخ میں ایسے ادوار بھی آئے جب جمہوری عمل مضبوط ہوا، اور ایسے مراحل بھی جب غیر منتخب قوتوں کے کردار، جماعت سازی، اقتدار کی کشمکش اور ریاستی مفادات کے نام پر سیاسی عمل مختلف سمتوں میں موڑ دیا گیا۔

اس حصے میں کسی فرد، جماعت یا ادارے کے حق یا مخالفت میں فیصلہ صادر کرنے کے بجائے تاریخی واقعات، آئینی اصولوں اور جمہوری ارتقا کے تناظر میں ان سوالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کوشش یہ ہے کہ پاکستان کی سیاست کو جذبات یا وابستگیوں کے بجائے تاریخی شواہد، آئینی فکر اور ریاستی تجربات کی روشنی میں سمجھا جائے۔

ان مضامین کا بنیادی استدلال یہ ہے کہ مضبوط ریاست کی بنیاد صرف طاقت نہیں بلکہ آئین کی بالادستی، جمہوری تسلسل، آزاد سیاسی عمل، جواب دہ ادارے اور عوامی اعتماد ہوتے ہیں۔ تاریخ یہی بتاتی ہے کہ جب ریاست اور جمہوریت ایک دوسرے کی تکمیل کریں تو استحکام پیدا ہوتا ہے، اور جب یہ ایک دوسرے کے مدمقابل آ جائیں تو سیاسی بحران جنم لیتے ہیں۔

یہ حصہ اسی فکری سفر کی ایک کوشش ہے تاکہ پاکستان کے ماضی کو سمجھتے ہوئے مستقبل کے لیے زیادہ متوازن، اصولی اور حقیقت پسندانہ زاویۂ نظر اختیار کیا جا سکے۔

باب دوازدہم

فوج، سیاست اور پاکستان: تاریخ کیا کہتی ہے؟

بعض لوگ اس سوچ کے حامل ہیں کہ فوج پر تنقید سے پہلے عوام کو دیکھنا چاہیے، جو باہم تقسیم ہیں؛ سیاست دانوں کو دیکھنا چاہیے، جو ایک دوسرے کو چور کہتے ہیں؛ اور ان حکمرانوں کو دیکھنا چاہیے جو قومی مفاد کے بجائے ذاتی مفادات کو ترجیح دیتے ہیں۔ بلاشبہ اس بات میں وزن موجود ہے کہ پاکستان کی سیاسی تاریخ بے شمار کمزوریوں، غلطیوں اور بدعنوانیوں سے بھری پڑی ہے۔ لیکن اصل سوال یہ نہیں کہ سیاست دان فرشتے ہیں یا نہیں، بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ کیا سیاست دانوں کی خرابی فوجی مداخلت کا جواز بن سکتی ہے؟

اگر یہی اصول تسلیم کر لیا جائے تو دنیا میں جمہوریت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، کیونکہ شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جہاں سیاست دان غلطیوں، کرپشن یا اقتدار کی کشمکش سے مکمل طور پر پاک ہوں۔ قومیں افراد کی کمزوریوں کا علاج آئین، قانون اور احتساب کے ذریعے کرتی ہیں، ٹینکوں اور مارشل لا کے ذریعے نہیں۔

جنرل ایوب خان، جنرل یحییٰ خان اور جنرل ضیاء الحق کو ملک بچانے والا قرار دیتے ہیں۔ لیکن تاریخ کا فیصلہ جذبات سے نہیں بلکہ نتائج سے کیا جاتا ہے۔

جنرل ایوب خان نے 1958ء میں آئین معطل کر کے اقتدار سنبھالا۔ ان کے دور میں بعض معاشی اشاریے بہتر ہوئے، لیکن یہی وہ دور تھا جس میں مشرقی پاکستان میں احساسِ محرومی شدت اختیار کر گیا، سیاسی جماعتوں کو کمزور کیا گیا اور جمہوری ارتقاء کا راستہ روکا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک شدید عوامی تحریک اٹھی اور بالآخر انہیں اقتدار چھوڑنا پڑا۔

اس کے بعد جنرل یحییٰ خان اقتدار میں آئے۔ اگر فوجی حکمرانی قومی مسائل کا حل ہوتی تو 1971ء کا سانحہ کیوں پیش آتا؟ سقوطِ ڈھاکہ پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا قومی المیہ تھا۔ ملک دو لخت ہو گیا، لاکھوں لوگ متاثر ہوئے اور تقریباً نوے ہزار پاکستانی فوجی جنگی قیدی بنے۔ یہ سب کچھ ایک فوجی حکومت کے دور میں ہوا۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ نے بھی سیاسی قیادت کے ساتھ ساتھ عسکری اور انتظامی غلطیوں کی نشاندہی کی۔

پھر جنرل ضیاء الحق کا دور آیا۔ ان کے بعض اقدامات سے اختلاف اور اتفاق دونوں کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اسی دور میں منتخب حکومت کا خاتمہ ہوا، سیاسی عمل معطل رہا، ریاستی اداروں کی سیاست میں مداخلت مزید گہری ہوئی، اور افغان جنگ کے اثرات نے پاکستانی معاشرے کو اسلحہ، انتہاپسندی اور منشیات جیسے مسائل سے دوچار کیا، جن کے اثرات آج بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

تاریخ کا ایک اور دلچسپ مگر افسوسناک پہلو بھی ہے۔

پاکستان میں اکثر وہی سیاسی شخصیات اور جماعتیں بعد میں ریاستی طاقت کے نشانے پر آئیں جن کے بارے میں یہ تاثر موجود رہا کہ ان کے اقتدار کے قیام یا استحکام میں اسٹیبلشمنٹ کا کردار تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو سقوطِ ڈھاکہ کے بعد کے سیاسی بندوبست میں اقتدار تک پہنچے، مگر چند ہی برس بعد جنرل ضیاء الحق نے ان کی حکومت ختم کر دی اور وہی بھٹو تختۂ دار تک پہنچا دیے گئے۔

میاں نواز شریف جنرل ضیاء الحق کے دور میں قومی سیاست میں ابھرے، مگر بعد ازاں جنرل پرویز مشرف نے ان کی منتخب حکومت کا تختہ الٹ دیا اور انہیں جلاوطنی اختیار کرنا پڑی۔

جنرل پرویز مشرف خود اقتدار کے ایوانوں میں داخل ہوئے تو یہ دعویٰ کیا گیا کہ وہ ملک کو سیاسی بحرانوں سے نجات دلائیں گے، لیکن ان کا دور بھی شدید سیاسی محاذ آرائی اور ادارہ جاتی کشمکش پر ختم ہوا۔

حالیہ برسوں میں عمران خان کے بارے میں بھی ایک وسیع سیاسی تاثر موجود رہا کہ 2018ء کے سیاسی ماحول میں طاقتور حلقوں کی حمایت انہیں حاصل تھی، مگر بعد ازاں وہی عمران خان ریاستی اداروں کے سخت ترین ناقد بن کر سامنے آئے اور شدید سیاسی تصادم کا شکار ہوئے۔

یہ محض چند افراد کی داستان نہیں بلکہ پاکستان کے سیاسی المیے کا خلاصہ ہے۔ جو قوتیں کسی کو اقتدار تک پہنچاتی ہیں، اکثر وہی بعد میں اس کے اقتدار کے خاتمے کا سبب بھی بنتی ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نہ سیاسی جماعتیں مضبوط ہوتی ہیں، نہ جمہوری ادارے مستحکم ہوتے ہیں اور نہ ہی عوام کا نظام پر اعتماد قائم رہتا ہے۔

فوج کی قربانیوں سے کسی ذی شعور شخص کو انکار نہیں ہو سکتا۔ وطن کے دفاع میں جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والے جوان پوری قوم کا سرمایہ ہیں۔ لیکن ایک سپاہی کی قربانی اور ایک فوجی حکمران کے سیاسی فیصلے دو الگ چیزیں ہیں۔ پہلی چیز احترام کا تقاضا کرتی ہے جبکہ دوسری تنقید اور احتساب سے بالاتر نہیں ہو سکتی۔

یہ کہنا بھی درست نہیں کہ پاکستان کی تمام شہرت صرف فوج کی وجہ سے ہے۔ پاکستان کو عالمی سطح پر پہچان دینے والوں میں ہمارے سائنس دان، انجینئر، ڈاکٹر، اساتذہ، مزدور، کسان، صنعت کار اور کھلاڑی بھی شامل ہیں۔ قومیں صرف عسکری طاقت سے نہیں بلکہ علمی، معاشی، اخلاقی اور سیاسی قوت سے ترقی کرتی ہیں۔

اصل مسئلہ فوج یا سیاست دان نہیں بلکہ اصول ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے بارہا اس حقیقت کی نشاندہی کی کہ افراد سے زیادہ اہم ادارے اور اصول ہوتے ہیں۔ اگر ایک خرابی کے علاج کے لیے آئین توڑا جائے تو دوسری اور بڑی خرابی جنم لیتی ہے۔

پاکستان کی گزشتہ سات دہائیوں کی تاریخ ایک واضح سبق دیتی ہے: جب بھی کسی ادارے نے اپنے آئینی دائرے سے تجاوز کیا، وقتی استحکام تو حاصل ہوا مگر طویل المدت بحران مزید گہرے ہوئے۔ اور جب بھی آئین، قانون اور عوامی رائے کو راستہ دیا گیا، نظام میں اصلاح اور ارتقاء کے امکانات پیدا ہوئے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ "ہر فوجی مداخلت ملک بچانے کے لیے تھی" ایک سیاسی رائے تو ہو سکتی ہے، لیکن اسے مسلمہ تاریخی حقیقت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تاریخ کا ریکارڈ اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور تلخ ہے۔

پاکستان کی بقا کسی ایک فرد، جماعت یا ادارے کی بالادستی میں نہیں بلکہ آئین کی بالادستی، قانون کی حکمرانی، اداروں کی حدود اور عوام کی سیاسی بلوغت میں ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جو قوموں کو استحکام دیتا ہے، اور یہی وہ سبق ہے جو پاکستان کی پوری تاریخ ہمیں سکھاتی ہے۔

باب سہزدہم

استحکام پاکستان پارٹی کا آزاد کشمیر میں ظہور: کیا واقعی تبدیلی کی نوید؟

آزاد کشمیر میں استحکام پاکستان پارٹی (IPP) کا ظہور بلاشبہ ایک اہم سیاسی پیش رفت ہے، لیکن اصل سوال یہ ہے کہ کیا یہ ایک نئی سیاسی سوچ کی نمائندہ جماعت ہے یا محض پرانے سیاسی چہروں کے لیے نیا پلیٹ فارم؟

آزاد کشمیر کی سیاست گزشتہ کئی دہائیوں سے شخصیات، دھڑے بندی، اقتدار کی کشمکش اور الیکٹیبلز کے گرد گھومتی رہی ہے۔ جماعتیں بدلتی رہی ہیں، حکومتیں آتی جاتی رہی ہیں، مگر عوام کو درپیش بنیادی مسائل، کمزور طرزِ حکمرانی، میرٹ کی پامالی، ادارہ جاتی کمزوری اور سیاسی عدم استحکام اپنی جگہ برقرار رہے۔ ایسے میں اگر صرف مختلف جماعتوں سے ٹکٹ نہ ملنے والے یا سیاسی مفادات کے تحت وفاداریاں تبدیل کرنے والے افراد کسی نئی جماعت میں جمع ہو جائیں تو اسے حقیقی سیاسی تبدیلی قرار دینا قبل از وقت ہوگا۔

جمہوری سیاست میں نئی جماعتوں کا قیام ایک مثبت عمل ہے، بشرطیکہ وہ عوام کو ایک واضح نظریہ، اصلاحاتی پروگرام اور بہتر طرزِ حکمرانی کا قابلِ عمل خاکہ پیش کریں۔ اگر کسی جماعت کی اصل طاقت صرف الیکٹیبلز ہوں، جبکہ اس کا منشور، تنظیم اور عوامی وژن واضح نہ ہو، تو ایسی جماعتیں عموماً اقتدار کی سیاست تو کر لیتی ہیں مگر نظام میں بنیادی تبدیلی نہیں لا پاتیں۔

آزاد کشمیر میں حالیہ عوامی احتجاج، دھرنے اور سیاسی بے چینی نے یہ ثابت کیا ہے کہ مسئلہ صرف حکومتوں کی تبدیلی کا نہیں بلکہ عوام کے اعتماد کی بحالی کا ہے۔ جب لوگوں کو یہ احساس ہو کہ فیصلے عوامی امنگوں کے بجائے سیاسی مفادات کے تابع ہیں تو بے چینی بڑھتی ہے، اور یہی کیفیت وقت کے ساتھ مختلف تحریکوں اور احتجاجی شکلوں میں سامنے آتی ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آزاد کشمیر کی مقامی سیاسی جماعتیں اندرونی اختلافات، کمزور تنظیم اور واضح سیاسی حکمتِ عملی کے فقدان کے باعث بتدریج محدود ہوتی گئی ہیں، جس سے قومی سیاسی جماعتوں کے لیے میدان مزید وسیع ہوا۔ لیکن صرف نئی جماعت کا قیام اس خلا کو پُر نہیں کر سکتا، جب تک وہ سیاسی کلچر، احتساب، میرٹ، شفافیت اور عوامی خدمت کے حوالے سے خود کو عملی طور پر مختلف ثابت نہ کرے۔

آزاد کشمیر کی سیاست میں جماعتیں بدلنے کا رجحان کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ بیرسٹر سلطان محمود چوہدری پاکستان پیپلز پارٹی کے پلیٹ فارم سے آزاد کشمیر کے وزیر اعظم اور بعد ازاں صدر منتخب ہوئے، پھر مسلم کانفرنس، اس کے بعد پاکستان تحریک انصاف اور بعد میں دیگر سیاسی صف بندیوں کا حصہ بنتے رہے۔ حاجی محمد یعقوب مختلف ادوار میں پاکستان پیپلز پارٹی، پاکستان تحریک انصاف اور اب استحکام پاکستان پارٹی سے وابستہ ہیں۔ اسی طرح سردار تنویر الیاس خان پاکستان تحریک انصاف کے پلیٹ فارم سے وزارتِ عظمیٰ تک پہنچے، بعد ازاں پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی، اور پھر پیپلز پارٹی سے استعفیٰ دے کر استحکام پاکستان پارٹی میں شامل ہو گئے۔

یہ چند مثالیں اس سیاسی کلچر کی عکاسی کرتی ہیں جہاں جماعتیں بدلتی رہتی ہیں مگر چہرے وہی رہتے ہیں۔ ایک ہی سیاست دان کبھی ایک جماعت، کبھی دوسری اور کبھی تیسری جماعت میں دکھائی دیتا ہے۔ انتخابات سے قبل وفاداریاں تبدیل کرنا، ٹکٹ کی بنیاد پر جماعتیں بدلنا اور اقتدار کے قریب رہنے کے لیے سیاسی صف بندیاں تبدیل کرنا ہماری سیاست کا معمول بن چکا ہے۔ اس طرزِ سیاست نے عوام کے اندر یہ تاثر مضبوط کیا ہے کہ اکثر سیاست دانوں کی اولین ترجیح نظریہ، منشور یا عوامی خدمت نہیں بلکہ اقتدار تک رسائی ہے۔ جب افراد بدلنے کے بجائے صرف جماعتیں بدلتی رہیں تو عوام کے مسائل بھی وہیں کے وہیں رہتے ہیں۔ ایسے ماحول میں عوام کے لیے یہ سوال کرنا بالکل بجا ہے کہ اگر ہر انتخاب میں صرف جھنڈے اور انتخابی نشان تبدیل ہوں، جبکہ امیدوار وہی رہیں، تو پھر حقیقی تبدیلی کہاں سے آئے گی؟

اسی پس منظر میں جماعت اسلامی آزاد کشمیر نسبتاً مختلف دکھائی دیتی ہے۔ اس کی قیادت اور کارکنوں کی اکثریت روایتی الیکٹیبلز کی سیاست کا حصہ نہیں رہی، اور نہ ہی اس جماعت کی شناخت سیاسی وفاداریاں تبدیل کرنے والے چہروں سے وابستہ ہے۔ اگرچہ کوئی بھی جماعت تنقید سے بالاتر نہیں اور نہ ہی یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے پاس تمام مسائل کا فوری حل موجود ہے، لیکن جمہوریت کا تقاضا یہی ہے کہ عوام نئی اور نسبتاً غیر آزمودہ قیادت کو بھی موقع دیں۔

اگر آزاد کشمیر کے عوام بار بار انہی آزمائے ہوئے چہروں اور جماعتوں کو اقتدار میں لاتے رہیں گے تو نتائج بھی مختلف نہیں ہوں گے۔ اس لیے وقت آ گیا ہے کہ عوام اور خواص دونوں شخصیت، برادری اور وقتی سیاسی مفادات سے بالاتر ہو کر کردار، دیانت، نظریے اور کارکردگی کی بنیاد پر فیصلہ کریں۔ اگر واقعی تبدیلی مطلوب ہے تو کم از کم ایک مرتبہ جماعت اسلامی آزاد کشمیر کو خدمت کا موقع دیا جانا چاہیے۔ اگر وہ بھی عوام کی توقعات پر پورا نہ اترے تو اسے بھی دیگر جماعتوں کی طرح عوامی عدالت میں جواب دہ ہونا ہوگا، لیکن اسے موقع دیے بغیر تبدیلی کی امید رکھنا نہ جمہوری رویہ ہے اور نہ ہی حقیقت پسندانہ طرزِ فکر۔

باب چہاردہم

تعصب کے مقابلے میں حقیقت کی گواہی

کسی دعوے کا جواب دلیل سے دیا جاتا ہے، ردِعمل سے نہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں بعض اوقات ایک انتہا کے رد میں دوسری انتہا اختیار کر لی جاتی ہے، اور یوں حقائق کی جگہ جذبات لے لیتے ہیں۔

زیر بحث تحریر بھی اسی طرزِ فکر کی مثال ہے۔ چند افراد اگر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ "آزاد کشمیر والے سوئچ بند کر دیں تو پورا پاکستان اندھیرے میں ڈوب جائے گا"، تو یہ یقیناً ایک مبالغہ آمیز اور غیر فنی دعویٰ ہے۔ پاکستان کا قومی گرڈ متعدد آبی، تھرمل، جوہری اور قابلِ تجدید ذرائع پر مشتمل ہے، اور کسی ایک خطے کی بجلی بند ہونے سے بحران تو پیدا ہو سکتا ہے مگر پورا نظام ختم نہیں ہو جاتا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا چند افراد کے اس غیر منطقی دعوے کا جواب یہ ہونا چاہیے کہ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کی اہمیت کو کم کر کے پیش کیا جائے؟ کیا علمی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک مبالغے کی تردید دوسرے مبالغے سے کی جائے؟

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے پن بجلی وسائل کا بڑا حصہ دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کے اس نظام سے وابستہ ہے جس کا سرچشمہ گلگت بلتستان اور جموں و کشمیر کے پہاڑی علاقوں میں واقع ہے۔ منگلا، نیلم جہلم، پترند، کروٹ اور متعدد دیگر منصوبے اسی خطے کے آبی وسائل سے وابستہ ہیں۔ اسی طرح دیامر بھاشا، بنجی اور دیگر مستقبل کے منصوبے بھی انہی علاقوں کی جغرافیائی اہمیت کو نمایاں کرتے ہیں۔

یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ آزاد جموں و کشمیر اور گلگت بلتستان کی آئینی حیثیت پاکستان کے صوبوں جیسی نہیں۔ خود پاکستان کا سرکاری مؤقف یہ ہے کہ یہ ریاست جموں و کشمیر کے وہ علاقے ہیں جن کے مستقبل کا فیصلہ کشمیری عوام کے حقِ خود ارادیت کے مطابق ہونا ہے۔ اس لیے ان علاقوں کے وسائل کا ذکر کرتے وقت محض انتظامی اختیار کو ملکیتی حق میں تبدیل کر دینا نہ تاریخی طور پر درست ہے اور نہ آئینی طور پر۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم قومی معاملات کو تعاون کے بجائے برتری کے زاویے سے دیکھنے لگے ہیں۔ کوئی کہتا ہے پاکستان ہمارے وسائل پر زندہ ہے، اور کوئی جواب میں کہتا ہے تمہاری حیثیت چند فیصد سے زیادہ نہیں۔ دونوں رویے ایک ہی بیماری کی دو علامتیں ہیں۔

قومیں اس وقت مضبوط ہوتی ہیں جب وہ ایک دوسرے کے کردار کا اعتراف کرتی ہیں۔ پنجاب کی زرعی پیداوار، سندھ کی بندرگاہیں، خیبر پختونخوا کے آبی وسائل، بلوچستان کی معدنی دولت، گلگت بلتستان کے پہاڑ اور آزاد کشمیر کے دریا؛ یہ سب مل کر ایک معاشی و جغرافیائی اکائی تشکیل دیتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کی اہمیت گھٹانے سے دوسرے کی اہمیت نہیں بڑھتی۔

اگر کوئی کشمیری یہ کہتا ہے کہ پورا پاکستان صرف ہماری بجلی پر چلتا ہے تو وہ حقیقت سے تجاوز کرتا ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کی حیثیت قومی توانائی کے نظام میں معمولی سی ہے، تو وہ بھی حقیقت کا انکار کرتا ہے۔

عدل کا تقاضا یہ ہے کہ نہ کسی کا حق بڑھایا جائے اور نہ کسی کا حق گھٹایا جائے۔ قرآن کا اصول یہی ہے کہ کسی قوم کے بارے میں دشمنی یا محبت تمہیں انصاف سے نہ ہٹائے۔ جب قومیں انصاف چھوڑ دیتی ہیں تو حقائق بھی ان کے ہاتھوں تعصب کا شکار ہو جاتے ہیں۔

لہٰذا صحیح موقف یہ نہیں کہ "پاکستان آزاد کشمیر کا محتاج ہے" اور نہ یہ کہ "آزاد کشمیر کی کوئی حیثیت نہیں"۔ صحیح موقف یہ ہے کہ ہر خطہ اپنی جگہ اہم ہے، ہر خطے کا حق تسلیم کیا جانا چاہیے، اور کسی خطے کی اہمیت کو چند جذباتی نعروں کے رد میں کم کر کے پیش کرنا علمی دیانت کے خلاف ہے۔

باب پانزدہم

نظریاتی ریاستیں نعروں سے نہیں، ریاستی عمل سے پہچانی جاتی ہیں

دنیا کی سیاسی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ نظریات صرف کتابوں یا انتخابی منشوروں میں نہیں رہتے بلکہ جب کوئی قیادت ان پر یقین رکھتی ہے تو وہ قانون، تعلیم، معیشت، عدلیہ، انتظامیہ اور ریاستی اداروں کو بھی اسی نظریے کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتی ہے۔

بھارت میں نریندر مودی کی سیاسی تربیت راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (RSS) میں ہوئی۔ بعد ازاں بھارتیہ جنتا پارٹی (BJP) کی قیادت کرتے ہوئے انہوں نے ہندوتوا کو اپنی سیاست کا مرکزی بیانیہ بنایا۔ متعدد ملکی و بین الاقوامی مبصرین کے مطابق ان کے دور میں شہریت کے قانون، تعلیمی نصاب، ثقافتی بیانیے اور دیگر ریاستی پالیسیوں میں اس نظریاتی رجحان کی جھلک نمایاں ہوئی، اگرچہ ان اقدامات پر بھارت کے اندر اور باہر مختلف آراء موجود ہیں۔

امریکہ میں ڈونلڈ ٹرمپ نے "America First" کو اپنی سیاست کا بنیادی اصول بنایا۔ ان کی حکومت کی امیگریشن، سرحدی سلامتی، تجارتی پالیسی، خارجہ حکمتِ عملی اور وفاقی تقرریوں میں اس نظریے کی واضح جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

پاکستان بھی ایک نظریاتی جدوجہد کے نتیجے میں وجود میں آیا، لیکن قیامِ پاکستان کے بعد ریاست کے نظریاتی تشخص اور اس کی عملی تعبیر ہمیشہ سیاسی اختلاف کا موضوع رہی۔

ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں 1973ء کا آئین منظور ہوا جس میں اسلام کو ریاستی مذہب قرار دیا گیا، اسلامی دفعات شامل کی گئیں اور اسلامی نظریاتی کونسل کو آئینی حیثیت دی گئی۔

جنرل محمد ضیاء الحق نے اسلامائزیشن کو ریاستی پالیسی بنایا اور حدود آرڈیننس، زکوٰۃ و عشر، وفاقی شرعی عدالت اور دیگر اقدامات متعارف کرائے۔ ان اقدامات کو بعض حلقے نظریۂ پاکستان کے عملی اظہار کے طور پر دیکھتے ہیں، جبکہ ناقدین انہیں سیاسی مقاصد سے بھی جوڑتے ہیں۔

میاں نواز شریف نے اپنے مختلف ادوارِ حکومت میں شریعت بل اور اسلامی قانون سازی کی بعض کوششیں کیں، تاہم وہ مکمل طور پر نافذ نہ ہو سکیں۔

عمران خان نے "ریاستِ مدینہ" کو اپنی سیاسی فکر کا مرکزی عنوان بنایا اور یکساں قومی نصاب، رحمت للعالمینؐ اتھارٹی اور دیگر اقدامات کیے، مگر ناقدین کے نزدیک ریاستی نظام میں وہ بنیادی تبدیلی نہ آ سکی جس کا تصور پیش کیا گیا تھا۔

دوسری جانب پاکستان پیپلز پارٹی نے اپنی سیاست کی بنیاد جمہوریت، پارلیمانی نظام، وفاقیت اور سماجی انصاف پر رکھی، جبکہ جنرل پرویز مشرف نے "روشن خیال اعتدال" (Enlightened Moderation) کی پالیسی اختیار کی۔ مذہبی و نظریاتی حلقوں کی ایک بڑی تعداد نے ان دونوں سیاسی تعبیرات کو اسلامی ریاست کے روایتی تصور سے مختلف قرار دیا۔

اس پورے تناظر میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اصولی بات یہ بیان کی کہ ریاست کبھی نظریاتی طور پر غیر جانب دار نہیں ہوتی۔ اگر کوئی ریاست اسلام کو اپنا نظریہ قرار دیتی ہے تو اس کے قانون، حکومت اور ریاستی اداروں کو بھی اسی نظریے کا پابند ہونا چاہیے۔

مولانا مودودی لکھتے ہیں:

«"اسلام دین و سیاست میں کسی تفریق کا روادار نہیں۔ وہ پوری زندگی کو خدا کے قانون کے تابع کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے سیاست کو بھی اسلامی اصولوں پر مرتب کرتا ہے اور ریاست کو اسلام کے قیام اور اس کے استحکام کے لیے استعمال کرتا ہے۔"»

(ماخذ: "اسلامی ریاست"، باب: "اسلام کا سیاسی نظریہ")

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

«"اسلامی سیاست کا سنگ بنیاد یہ قاعدہ ہے کہ حکم دینے اور قانون بنانے کے اختیارات تمام انسانوں سے فرداً فرداً اور مجتمعاً سلب کر لیے جائیں... یہ اختیار صرف اللہ کو ہے۔"»

(ماخذ: "اسلامی ریاست"، باب: "نظریۂ سیاسی کے اولین اصول")

اسی تصور کو انہوں نے "اسلام کا نظامِ حیات" میں مزید واضح کرتے ہوئے لکھا:

«"اسلام کے سیاسی نظام کی بنیاد تین اصولوں پر رکھی گئی ہے: توحید، رسالت اور خلافت۔"»

(ماخذ: "اسلام کا نظامِ حیات"، باب: "اسلام کا سیاسی نظام")

حاصلِ کلام یہ ہے کہ تاریخ میں نظریات کی کامیابی کا معیار نعروں کی کثرت نہیں بلکہ ریاستی عمل ہوتا ہے۔ جو قیادت اپنے نظریے پر حقیقی ایمان رکھتی ہے وہ اسے صرف تقریروں میں نہیں بلکہ قانون، تعلیم، عدلیہ، انتظامیہ، معیشت اور قومی اداروں میں نافذ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہی وہ معیار ہے جس پر دنیا نریندر مودی، ڈونلڈ ٹرمپ اور دیگر نظریاتی قیادتوں کا تجزیہ کرتی ہے، اور یہی معیار پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں اور حکمرانوں پر بھی یکساں طور پر لاگو ہونا چاہیے۔

حصہ چہارم

وسیع تر مسلم سیاسی تناظر

تعارفی نوٹ

کشمیر کا مسئلہ اپنی اہمیت کے باوجود ایک الگ تھلگ واقعہ نہیں، بلکہ مسلم دنیا کی وسیع تر سیاسی، فکری اور تزویراتی صورتِ حال سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ خطے کی بڑی ریاستوں کی پالیسیاں، عالمی طاقتوں کے مفادات، مذہبی و نظریاتی بیانیے اور امتِ مسلمہ کے داخلی اختلافات، سب کسی نہ کسی انداز میں کشمیر سمیت دیگر مسلم تنازعات پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

اس حصے میں شامل مضامین کشمیر کے دائرے سے آگے بڑھ کر ان وسیع تر سوالات کا جائزہ لیتے ہیں جو پاکستان، ایران، فلسطین اور مجموعی مسلم دنیا کی سیاست سے متعلق ہیں۔ یہاں مقصد کسی ایک ریاست، جماعت یا نظریے کی وکالت نہیں، بلکہ اصول، عدل، قومی مفاد اور امتِ مسلمہ کے اجتماعی مستقبل کے تناظر میں ان معاملات کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہے۔
"ایران، پاکستان اور فلسطین — اصل سوال کیا ہے؟" ایک ایسے حساس موضوع پر گفتگو کرتا ہے جس میں جذباتی وابستگیوں کے بجائے اصولی اور حقیقت پسندانہ تجزیے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد "امیدِ سحر" مستقبل کے امکانات، اجتماعی بیداری اور اصلاح کی امید کو موضوع بناتا ہے، جبکہ "وہ صبح کبھی تو آئے گی" مایوسی کے ماحول میں امید، استقامت اور بہتر مستقبل کے یقین کی علامت کے طور پر اس کتاب کا اختتامی باب تشکیل دیتا ہے۔

اس حصے کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ مسلم دنیا کے مسائل کا پائیدار حل محض نعروں، وقتی جذبات یا وقتی اتحاد و اختلاف میں نہیں، بلکہ انصاف، علم، سیاسی بصیرت، اخلاقی قیادت اور اصولی طرزِ عمل میں مضمر ہے۔ جب تک ریاستیں اور معاشرے ان بنیادوں پر اپنی سمت متعین نہیں کرتے، اس وقت تک نہ داخلی استحکام حاصل ہو سکتا ہے اور نہ ہی امتِ مسلمہ اپنے مشترکہ چیلنجز کا مؤثر جواب دے سکتی ہے۔ یہی وہ فکری پس منظر ہے جس کے ساتھ اس کتاب کا اختتام امید، ذمہ داری اور مستقبل کے امکانات پر ہوتا ہے۔

باب شانزدہم

ایران، پاکستان اور فلسطین: اصل سوال کیا ہے؟

بعض اوقات ایک مختصر جملہ وہ سوال اٹھا دیتا ہے جسے طویل سیاسی مباحث بھی پوری طرح واضح نہیں کر پاتے۔ اس باب کی فکری بنیاد بھی ایک ایسے ہی مختصر مگر نہایت فکر انگیز تبصرے سے استوار ہوئی، جس میں معروف محقق اور مصنف جناب انور عباسی نے لکھا:

"ایران کامیاب ہوا، الحمد للہ۔ پاکستان سرخرو ہوا، ثم الحمد للہ۔ مگر کیا کسی کو یاد ہے کہ یہ جنگ فلسطینیوں کی وجہ سے شروع ہوئی تھی؟ ان لاوارثوں کا کیا ہوا؟"
— انور عباسی

یہ چند سطور دراصل اس بنیادی سوال کی یاد دہانی ہیں کہ جب طاقت، سیاست، عسکری حکمتِ عملی اور سفارت کاری زیرِ بحث ہوں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اصل مظلوم ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ یہی سوال اس باب کا نقطۂ آغاز بھی ہے۔ زیرِ نظر تحریر اسی سوال کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کی ایک کوشش ہے۔

گزشتہ مہینوں میں دنیا نے طاقت کے بڑے بڑے مظاہرے دیکھے۔ میزائلوں کی گھن گرج سنی، عسکری حکمتِ عملیوں پر تبصرے ہوئے، علاقائی طاقتوں کے کردار زیرِ بحث آئے، اور مختلف ممالک کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے تجزیے کیے گئے۔ لیکن اس سارے شور میں ایک آواز مسلسل دبتی چلی گئی: فلسطین کی آواز۔

یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ مشرقِ وسطیٰ کی حالیہ کشیدگی کا بنیادی پس منظر فلسطین ہے۔ وہی فلسطین جس کے بچے آج بھی ملبوں کے درمیان زندگی تلاش کر رہے ہیں، جس کی مائیں آج بھی اپنے پیاروں کی لاشیں ڈھونڈ رہی ہیں، اور جس کے عوام آج بھی دنیا کے ضمیر سے انصاف کی بھیک مانگ رہے ہیں۔

افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہم مسلمان بھی اکثر واقعات کے ظاہری مظاہر میں الجھ جاتے ہیں اور اصل مسئلے کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ ہم طاقت کے توازن، سیاسی صف بندیوں اور سفارتی کامیابیوں پر تو گفتگو کرتے ہیں، مگر اس ظلم کے خاتمے کی بات کم کرتے ہیں جس نے اس پورے خطے کو آگ میں جھونک رکھا ہے۔

بلاشبہ اگر کوئی مسلم ملک اپنے دفاع میں کامیاب ہوتا ہے تو یہ خوش آئند بات ہے۔ اگر کسی قوم کی عزت و وقار محفوظ رہتا ہے تو اس پر خوشی ہونی چاہیے۔ لیکن ایک صاحبِ ایمان کے لیے یہ کافی نہیں کہ وہ صرف اپنی پسندیدہ قوت کی کامیابی پر خوش ہو؛ اسے یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اس کشمکش کے اصل مظلوم کہاں کھڑے ہیں۔

فلسطین کوئی جغرافیائی تنازعہ نہیں، یہ امتِ مسلمہ کے اجتماعی شعور کا امتحان ہے۔ اگر ہماری نگاہوں سے فلسطین اوجھل ہوگیا تو ہم محض واقعات کا تعاقب کرتے رہ جائیں گے اور مقاصد کو کھو بیٹھیں گے۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم وقتی سیاسی وابستگیوں سے بلند ہو کر اصل مسئلے کو پہچانیں۔ ایران ہو یا پاکستان، عرب ہو یا عجم، کسی کی کامیابی فلسطین کے مسئلے کا متبادل نہیں بن سکتی۔ جب تک فلسطینی عوام کو انصاف نہیں ملتا، جب تک ان کی زمین، جان اور عزت محفوظ نہیں ہوتی، تب تک یہ سوال زندہ رہے گا کہ آخر اس پوری کشمکش کے مرکز میں موجود مظلوم قوم کا کیا بنا؟

یہی وہ سوال ہے جو ہمارے ضمیر کو بیدار رکھنا چاہیے، کیونکہ قومیں صرف طاقت سے نہیں، بلکہ انصاف کے ساتھ زندہ رہتی ہیں۔

باب ہفدہم

وہ صبح کبھی تو آئے گی

عوامی مسائل، احتجاج، اصلاح، ریاستی ذمہ داری

قوموں کی زندگی میں ایسے ادوار آتے ہیں جب بظاہر خاموش نظر آنے والا معاشرہ اپنے باطن میں اضطراب، محرومی اور بے یقینی کا ایک سمندر لیے ہوئے ہوتا ہے۔ ایسے لمحات تاریخ میں معمولی نہیں ہوتے، بلکہ یہی وہ موڑ ہوتے ہیں جہاں ریاستوں، قیادتوں اور قوموں کا اصل امتحان شروع ہوتا ہے۔ اگر عوام کی آواز کو عدل، حکمت اور خیرخواہی کے ساتھ سنا جائے تو وہ اصلاح کا ذریعہ بنتی ہے، لیکن اگر اسے نظر انداز کیا جائے تو یہی اضطراب وقت کے ساتھ ایک گہرے سیاسی اور سماجی بحران میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

آزاد کشمیر کی حالیہ عوامی تحریکیں اسی اجتماعی احساس کی عکاس ہیں۔ یہ صرف مہنگائی، بجلی، آٹے یا روزگار کا مسئلہ نہیں بلکہ ریاست اور عوام کے درمیان اعتماد کے رشتے کا سوال بھی ہے۔ جب ایک معاشرہ مسلسل یہ محسوس کرنے لگے کہ اس کی بنیادی ضروریات، جائز مطالبات اور اجتماعی وقار کو مطلوبہ اہمیت نہیں دی جا رہی تو احتجاج محض ایک سیاسی عمل نہیں رہتا بلکہ ایک سماجی پیغام بن جاتا ہے۔

کسی بھی ریاست کی طاقت اس کے محلات، سرکاری عمارتوں یا اعداد و شمار سے نہیں ناپی جاتی بلکہ اس کے عوام کے اطمینان، انصاف اور اعتماد سے پہچانی جاتی ہے۔ اگر ایک مریض کو صرف ایک ایم آر آئی (MRI) کروانے کے لیے سینکڑوں کلومیٹر کا سفر کرنا پڑے، اگر ایک ماں اپنے بچے کے علاج کے لیے دروازے دروازے ٹھوکریں کھائے، اگر ایک نوجوان اعلیٰ تعلیم کے باوجود باعزت روزگار سے محروم رہے، اگر دیہات بنیادی سڑک، صاف پانی اور معیاری تعلیم سے محروم ہوں، تو یہ صرف انتظامی کوتاہی نہیں بلکہ ریاستی ترجیحات پر ایک سنجیدہ سوال ہے۔

اسلام حکومت کو اقتدار نہیں بلکہ امانت قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

«"بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے سپرد کرو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔"
(سورۃ النساء: 58)»

اسی طرح فرمایا:

«"بے شک اللہ عدل، احسان اور قرابت داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔"
(سورۃ النحل: 90)»

یہ دونوں آیات واضح کرتی ہیں کہ اسلامی ریاست کی بنیاد طاقت نہیں بلکہ عدل، امانت اور خدمت ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«"تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔"
(صحیح بخاری، حدیث 7138؛ صحیح مسلم، حدیث 1829)»

یہ حدیث صرف حکمرانوں ہی نہیں بلکہ معاشرے کے ہر صاحبِ اختیار کو یہ احساس دلاتی ہے کہ اقتدار اور اختیار دونوں جواب دہی کے ساتھ وابستہ ہیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

«"اسلامی حکومت کا مقصد اپنے اقتدار کو باقی رکھنا نہیں بلکہ اللہ کے قانون کے مطابق عدل قائم کرنا اور لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرنا ہے۔"
(اسلامی ریاست)»

یہی وہ معیار ہے جس پر ہر حکومت اور ہر ریاست کو خود کو پرکھنا چاہیے۔

آزاد کشمیر کے عوام جن مطالبات کو سامنے لا رہے ہیں، ان میں صحت، تعلیم، روزگار، شفاف حکمرانی، وسائل کی منصفانہ تقسیم، سستی بجلی، مقامی وسائل پر منصفانہ حق، مضبوط بلدیاتی نظام اور میرٹ پر مبنی انتظامیہ جیسے نکات شامل ہیں۔ ان مطالبات کو اگر سیاسی عینک سے نہیں بلکہ انسانی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ان کا تعلق کسی جماعت کی کامیابی یا ناکامی سے نہیں بلکہ ایک باوقار اور فلاحی معاشرے کی تشکیل سے ہے۔

صحت کا شعبہ خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ جدید ہسپتال، ماہر ڈاکٹروں کی دستیابی، ٹراما سینٹرز، آئی سی یوز، کینسر کے علاج کی سہولیات، ایم آر آئی اور سی ٹی اسکین جیسی بنیادی تشخیصی خدمات کسی حکومت کا احسان نہیں بلکہ عوام کا بنیادی حق ہیں۔ اسی طرح معیاری تعلیم، جدید فنی تربیت اور نوجوانوں کے لیے باعزت روزگار صرف معاشی ضرورت نہیں بلکہ سماجی استحکام کی بنیاد ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر عوامی تحریک کی کامیابی کا انحصار اس کے اخلاق، نظم و ضبط اور پرامن کردار پر ہوتا ہے۔ اختلاف اگر تہذیب، قانون اور خیرخواہی کے دائرے میں رہے تو وہ معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ بنتا ہے، لیکن اگر نفرت، تشدد اور انتقام اس پر غالب آ جائیں تو اصل مقصد پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ اسی طرح حکومتوں پر بھی لازم ہے کہ وہ عوامی احتجاج کو اپنی توہین نہیں بلکہ احتساب اور اصلاح کا موقع سمجھیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ جن قوموں نے عوام اور ریاست کے درمیان اعتماد کو برقرار رکھا، وہ بحرانوں سے بھی سرخرو نکلیں، جبکہ جن معاشروں میں فاصلے بڑھتے گئے، وہاں طاقت بھی استحکام پیدا نہ کر سکی۔ حضرت عمر بن خطابؓ کا یہ قول حکمرانی کے اصول کو نہایت جامع انداز میں بیان کرتا ہے:

«"اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر جائے تو مجھے ڈر ہے کہ اس کے بارے میں بھی عمر سے سوال ہوگا۔"»

اگرچہ اس قول کی سند حدیث کی نہیں، لیکن اسلامی حکمرانی کے تصور میں جواب دہی اور عوامی خدمت کی روح کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔

قوموں کی تقدیر نعروں سے نہیں بلکہ کردار، انصاف، علم اور دیانت سے بدلتی ہے۔ جب حکمران اقتدار کو امانت سمجھیں، ادارے قانون کے تابع ہوں، وسائل امانت داری سے خرچ کیے جائیں، احتساب بلاامتیاز ہو اور ہر شہری کو عزت، انصاف اور بنیادی سہولیات میسر ہوں، تب ایک صالح، مضبوط اور باوقار معاشرے کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔

اسی حقیقت کو معروف شاعر ساحر لدھیانوی نے امید اور جدوجہد کی زبان دی:

«"انسانوں کی عزت جب جھوٹے سکوں میں نہ تولی جائے گی،

وہ صبح کبھی تو آئے گی۔"»

یہ صبح صرف سورج طلوع ہونے کا نام نہیں۔ یہ اس دن کی علامت ہے جب انصاف طاقت سے بلند ہوگا، قانون شخصیت سے بالاتر ہوگا، ریاست خدمت کا استعارہ ہوگی، نوجوان اپنے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں گے، مریض علاج کے لیے دربدر نہیں پھرے گا، اور ہر شہری اپنے آپ کو اس ریاست کا باعزت اور برابر کا شریک محسوس کرے گا۔

لیکن ایسی صبح انتظار سے نہیں آتی۔ اس کے لیے حکمرانوں کو انصاف اختیار کرنا ہوگا، اداروں کو دیانت داری اپنانا ہوگی، اہلِ علم کو حق گوئی کا فریضہ ادا کرنا ہوگا، اور عوام کو بھی قانون، نظم اور اجتماعی ذمہ داری کا شعور پیدا کرنا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے:

«"بے شک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلیں۔"
(سورۃ الرعد: 11)»

یہ آیت صرف ایک قرآنی نص نہیں بلکہ تاریخ کا اٹل قانون بھی ہے۔

وہ صبح ضرور آئے گی، مگر اس دن جب ریاست اور عوام ایک دوسرے کے مدِمقابل نہیں بلکہ ایک دوسرے کے معاون ہوں گے؛ جب اختلاف کو دشمنی نہیں بلکہ اصلاح کا ذریعہ سمجھا جائے گا؛ جب اقتدار کو اعزاز نہیں بلکہ امانت تصور کیا جائے گا؛ اور جب انصاف صرف عدالتوں کی دیواروں تک محدود نہیں بلکہ معاشرے کے ہر طبقے تک پہنچے گا۔

اسی صبح کا انتظار بھی ہے، اسی صبح کے لیے جدوجہد بھی، اور اسی صبح پر یقین ہی ایک زندہ قوم کی اصل پہچان ہے۔

باب ہشدہم

امیدِ سحر

آزاد کشمیر کا مستقبل — تاریخ، حقیقت اور قرآن و سنت کی روشنی میں

ہر قوم کی تاریخ میں ایسے موڑ آتے ہیں جب اسے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ آیا وہ ماضی کے نعروں میں زندہ رہے گی یا مستقبل کی تعمیر کے لیے حقیقت کا سامنا کرے گی۔ کشمیر کی گزشتہ تقریباً آٹھ دہائیوں کی تاریخ بھی اسی سوال کے گرد گھومتی ہے۔ اس عرصے میں بے شمار نعرے بلند ہوئے، سیاسی وعدے کیے گئے، جنگیں لڑی گئیں، معاہدے ہوئے، قراردادیں منظور ہوئیں اور قیادتیں بدلتی رہیں، مگر آج بھی مسئلہ کشمیر اپنی اصل صورت میں موجود ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ نعروں نے جذبات کو مہمیز تو دی، لیکن وہ اپنے آپ میں کوئی مستقل سیاسی حل پیدا نہ کر سکے۔

1947ء کے بعد اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے 21 اپریل 1948ء کو قرارداد نمبر 47 منظور کی، جبکہ 13 اگست 1948ء اور 5 جنوری 1949ء کی اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند و پاکستان (UNCIP) کی قراردادوں میں یہ اصول تسلیم کیا گیا کہ ریاست جموں و کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کشمیری عوام کی رائے کے مطابق ہونا چاہیے۔ اگرچہ یہ قراردادیں آج تک نافذ نہ ہو سکیں، لیکن انہوں نے اس تنازع کی بین الاقوامی حیثیت کو تسلیم کیا اور یہ واضح کیا کہ کشمیر محض ایک سرحدی تنازع نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں کے سیاسی مستقبل، شناخت اور بنیادی حقوق کا مسئلہ ہے۔

آزاد جموں و کشمیر کا عبوری آئین 1974ء ریاستی ارتقا میں ایک اہم سنگِ میل ہے، لیکن آئینی ڈھانچہ اس وقت تک مؤثر نہیں ہو سکتا جب تک اس کی بنیاد عدل، شفافیت، جواب دہی اور عوامی اعتماد پر استوار نہ ہو۔ تاریخ کا فیصلہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ ریاستیں قانون سے قائم ہوتی ہیں، مگر انصاف سے مضبوط بنتی ہیں۔

قرآن مجید بھی قوموں کے عروج و زوال کا یہی اصول بیان کرتا ہے:

«"بے شک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلیں۔"
(سورۃ الرعد: 11)»

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے کہ قوموں کی تقدیر اس وقت بدلتی ہے جب وہ اپنے افکار، اخلاق اور اجتماعی کردار میں تبدیلی پیدا کرتی ہیں۔ (تفہیم القرآن، سورۃ الرعد)

یہ صرف ایک مذہبی نصیحت نہیں بلکہ تاریخ کا وہ اٹل اصول ہے جس کی تصدیق ہر کامیاب تہذیب کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

«"اور یہ دن ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔"
(سورۃ آل عمران: 140)»

اور پھر امید کا چراغ بجھنے نہیں دیتا:

«"اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، یقیناً اللہ کی رحمت سے صرف کافر ہی ناامید ہوتے ہیں۔"
(سورۃ یوسف: 87)»

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«"طاقتور مومن اللہ کے نزدیک کمزور مومن سے بہتر اور زیادہ محبوب ہے، اگرچہ دونوں میں خیر ہے۔"
(صحیح مسلم: 2664)»

یہ طاقت صرف عسکری قوت نہیں بلکہ علم، کردار، انصاف، معیشت، نظم اور اخلاق کی طاقت بھی ہے۔

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

«"تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں پوچھا جائے گا۔"
(صحیح بخاری: 7138، صحیح مسلم: 1829)»

گویا قوموں کی تقدیر صرف حکمران نہیں بلکہ پوری قوم مل کر بناتی ہے۔

مولانا مودودیؒ اپنی کتاب "شہادتِ حق" میں لکھتے ہیں کہ امت کی ذمہ داری صرف حق کو مان لینا نہیں بلکہ اسے اجتماعی زندگی میں قائم کرنے کی جدوجہد کرنا بھی ہے۔ اسی طرح "اسلامی ریاست" میں وہ واضح کرتے ہیں کہ حکومت کا اصل مقصد اقتدار کا تحفظ نہیں بلکہ عدل کا قیام اور انسانوں کے حقوق کی حفاظت ہے۔ یہی وہ معیار ہے جس پر ہر ریاست، ہر حکومت اور ہر تحریک کو پرکھا جانا چاہیے۔

قرآن عدل کو ریاست کی بنیاد قرار دیتا ہے:

«"اے ایمان والو! اللہ کے لیے انصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔"
(سورۃ النساء: 135)»

کشمیر کا کوئی بھی پائیدار حل انصاف، قانون کی بالادستی، انسانی وقار اور عوامی اعتماد کے بغیر ممکن نہیں۔

آزاد کشمیر کے پاس بے شمار امکانات موجود ہیں۔ نوجوان نسل، بیرونِ ملک آباد کشمیری برادری، قدرتی وسائل، سیاحت، تعلیم اور مضبوط سماجی رشتے اس خطے کا حقیقی سرمایہ ہیں۔ اگر ان وسائل کو دیانت دار قیادت، شفاف حکمرانی، معیاری تعلیم، معاشی منصوبہ بندی اور مضبوط اداروں کے ساتھ جوڑ دیا جائے تو آزاد کشمیر پورے خطے کے لیے ترقی، استحکام اور خوش حالی کی مثال بن سکتا ہے۔

لیکن تاریخ صرف کتابوں میں نہیں لکھی جاتی، بلکہ انسانوں کی یادوں اور احساسات میں بھی محفوظ رہتی ہے۔

مجھے اپنے بچپن کا ایک منظر آج بھی اسی طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہو۔ کشمیر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں جب پاک فوج کے جوان ہمارے علاقے سے گزرتے تھے تو ہم معصوم بچے احتراماً کھڑے ہو جاتے، انہیں سلام کرتے اور دل میں یہ یقین رکھتے کہ یہ وہ محافظ ہیں جن کے ہاتھوں میں ہماری جان، عزت اور مستقبل کا تحفظ ہے۔ اس وقت نہ دلوں میں خوف تھا، نہ فاصلے تھے اور نہ ہی بدگمانی۔ صرف اعتماد، محبت اور اپنائیت تھی۔

آج جب اسی سرزمین سے خون کی خبریں آتی ہیں، نوجوانوں کے جنازے اٹھتے ہیں، ماؤں کی گودیں اجڑتی ہیں اور بچوں کے سر سے باپ کا سایہ چھن جاتا ہے تو دل بے اختیار سوال کرتا ہے کہ آخر وہ کون سی غلطیاں تھیں جنہوں نے اعتماد کو بداعتمادی میں بدل دیا؟ وہ کون سی کوتاہیاں تھیں جنہوں نے دلوں کے فاصلے اتنے بڑھا دیے کہ ایک دوسرے کی آواز سننا بھی مشکل ہو گیا؟

یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ ریاست کی طاقت ایک امانت ہے، اور ہر امانت کا پہلا تقاضا عدل ہے۔ اگر رعایا خود کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگے تو اہلِ اقتدار کو سب سے پہلے اپنے طرزِ عمل کا محاسبہ کرنا چاہیے، کیونکہ قومیں صرف طاقت سے نہیں بلکہ انصاف، حسنِ تدبیر اور اخلاقی اعتماد سے متحد رہتی ہیں۔ جب انصاف کمزور پڑ جائے تو طاقت بھی دلوں کو فتح نہیں کر سکتی۔

افسوس یہ ہے کہ اس آزمائش کی گھڑی میں نہ کشمیری سیاسی قیادت وہ کردار ادا کر سکی جس کی عوام کو امید تھی، اور نہ وہ حلقے جن کے ہاتھ میں اختیار ہے، عوامی اضطراب کو اس سنجیدگی سے محسوس کرتے ہیں جس کا یہ مسئلہ متقاضی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر روز کوئی ماں اپنے بیٹے سے محروم ہوتی ہے، کوئی باپ اپنے بڑھاپے کا سہارا کھو دیتا ہے اور کوئی بچہ یتیمی کی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے۔

اسلام نے انسانی جان کو غیر معمولی حرمت عطا کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«"مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔"
(صحیح بخاری، حدیث 10؛ صحیح مسلم، حدیث 40)»

اور حجۃ الوداع کے تاریخی خطبے میں آپ ﷺ نے فرمایا:

«"تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری عزت ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہے جیسے اس دن، اس مہینے اور اس شہر کی حرمت ہے۔"
(صحیح بخاری، حدیث 1739؛ صحیح مسلم، حدیث 1679)»

اس لیے کوئی بھی مقصد، خواہ وہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو، انسانی جان کی حرمت کو نظر انداز کرنے کا جواز نہیں بن سکتا۔ طاقت کا استعمال اگر ناگزیر بھی ہو تو اسے قانون، عدل اور اخلاق کی حدود میں رہنا چاہیے، کیونکہ ظلم جب بھی ہوتا ہے، خواہ کسی کے ہاتھوں ہو، ظلم ہی رہتا ہے۔

آج سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ واپسی کے تمام راستے کھلے رہیں۔ مکالمہ کمزوری نہیں بلکہ دانش مندی کی علامت ہے۔ اختلاف کو دشمنی اور تنقید کو بغاوت سمجھنے کی روش کسی معاشرے کو استحکام نہیں دے سکتی۔ دلوں کو فتح کرنے کا راستہ انصاف، خیرخواہی اور اعتماد سے گزرتا ہے، خوف اور جبر سے نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھی انہی اصولوں سے وابستہ ہے:

«"اللہ نے تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے وعدہ کیا ہے کہ وہ ضرور انہیں زمین میں اقتدار عطا کرے گا..."
(سورۃ النور: 55)»

مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں کہ یہ وعدہ کسی قوم یا نسل کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ایمان، صالح عمل، عدل اور اللہ کی اطاعت کے ساتھ مشروط ہے۔ یہی قرآن کا ابدی قانون ہے اور یہی تاریخ کا ناقابلِ تردید سبق۔

"کشمیر: نعروں سے حقیقت تک" کا حاصل بھی یہی ہے کہ نعرے قوموں کو بیدار تو کر سکتے ہیں، لیکن منزل تک نہیں پہنچا سکتے۔ منزل علم، انصاف، دیانت، اجتماعی شعور، مضبوط اداروں اور اخلاقی قیادت سے حاصل ہوتی ہے۔

آخر میں میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سرزمین کو امن عطا فرمائے، دلوں میں محبت پیدا کرے، اہلِ اختیار کو عدل، بصیرت اور خوفِ خدا نصیب فرمائے، اور کشمیری عوام کو وہ قیادت عطا کرے جو اقتدار نہیں بلکہ خدمت کو اپنا مقصد سمجھے۔ ہمیں یہ شعور بھی عطا ہو کہ کسی قوم کی اصل طاقت اس کے ہتھیار نہیں بلکہ اس کا انصاف، اس کے ادارے، اس کا اخلاقی کردار اور اس کے لوگوں کا باہمی اعتماد ہوتا ہے۔

جب قومیں اپنے ماضی سے سبق سیکھتی ہیں، حال کا دیانت داری سے محاسبہ کرتی ہیں اور مستقبل کو علم، عدل اور ایمان کی بنیاد پر تعمیر کرتی ہیں تو تاریک راتوں کے بعد سحر ضرور طلوع ہوتی ہے۔ یہی امیدِ سحر ہے، یہی اس کتاب کا پیغام ہے، اور یہی کشمیر کے روشن مستقبل کی حقیقی بنیاد بھی۔

مآخذ

قرآن مجید

1. القرآن الکریم۔
   - سورۃ الرعد، آیت 11۔
   - سورۃ آل عمران، آیت 140۔
   - سورۃ یوسف، آیت 87۔
   - سورۃ النساء، آیت 135۔
   - سورۃ النور، آیت 55۔

حدیث

2. البخاری، محمد بن اسماعیل۔ صحیح البخاری، کتاب الأحکام، حدیث: 7138۔

3. مسلم بن الحجاج۔ صحیح مسلم، کتاب القدر، حدیث: 2664۔

5. مسلم بن الحجاج۔ صحیح مسلم، کتاب الإمارة، حدیث: 1829۔

اقوام متحدہ کی دستاویزات

5. .United Nations Security Council. Resolution 47 (1948): The India–Pakistan Question. Adopted on 21 April 1948

6. .United Nations Commission for India and Pakistan (UNCIP). Resolution of 13 August 1948

7. .United Nations Commission for India and Pakistan (UNCIP). Resolution of 5 January 1949

آئینی دستاویزات

8. .(بشمول بعد کی آئینی ترامیم) Government of Azad Jammu and Kashmir. Azad Jammu and Kashmir Interim Constitution Act, 1974

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

9. مودودی، سید ابوالاعلیٰ۔ تفہیم القرآن۔ لاہور: ادارۂ ترجمان القرآن۔

- سورۃ الرعد، آیت 11۔
- سورۃ آل عمران، آیت 140۔
- سورۃ النور، آیت 55۔

10. مودودی، سید ابوالاعلیٰ۔ شہادتِ حق۔ لاہور: ادارۂ ترجمان القرآن۔

11. مودودی، سید ابوالاعلیٰ۔ اسلامی ریاست۔ لاہور: ادارۂ ترجمان القرآن۔

کشمیر پر مستند کتب

12. .Lamb, Alastair. Kashmir: A Disputed Legacy, 1846–1990. Roxford Books, 1991

13. .Korbel, Josef. Danger in Kashmir. Princeton University Press, 1954

14. .Bose, Sumantra. Kashmir: Roots of Conflict, Paths to Peace. Harvard University Press, 2003

15. .Snedden, Christopher. Understanding Kashmir and Kashmiris. Hurst Publishers, 2015

16. .Schofield, Victoria. Kashmir in Conflict: India, Pakistan and the Unending War. I.B. Tauris, Latest Edition

17. .Sökefeld, Martin. Redefining Kashmir: Politics of Identity and Belonging. Routledge, 2015

اختتامیہ

حقیقت کی تلاش کا سفر

ہر کتاب اپنے قاری کو کچھ سوالوں کے ساتھ چھوڑتی ہے۔ اگر وہ صرف جوابات دے کر ختم ہو جائے تو شاید معلومات میں اضافہ کر دے، لیکن اگر وہ سوچنے پر مجبور کر دے تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوتی ہے۔ میری خواہش یہی ہے کہ یہ کتاب بھی اسی دوسرے دائرے میں شمار ہو۔

اس کتاب میں زیرِ بحث آنے والے موضوعات بظاہر مختلف ہیں، مگر ان کے درمیان ایک مشترک رشتہ موجود ہے۔ کشمیر کی تاریخ ہو یا اس کی آئینی حیثیت، مہاجر نمائندگی کا سوال ہو یا ریاستی اداروں کا کردار، پاکستان کی سیاسی ارتقا ہو یا امتِ مسلمہ کو درپیش عالمی چیلنجز؛ ان سب کے مرکز میں ایک ہی سوال موجود ہے: کیا ہم اپنے فیصلے جذبات کی بنیاد پر کرتے ہیں یا اصولوں اور حقائق کی بنیاد پر؟

تاریخ کا سب سے بڑا سبق یہی ہے کہ قومیں صرف نعروں سے ترقی نہیں کرتیں۔ نعرے تحریک پیدا کر سکتے ہیں، مگر ریاستیں اصولوں، انصاف، علم، دیانت اور جواب دہی پر قائم رہتی ہیں۔ جب جذبات تحقیق پر غالب آ جائیں تو تاریخ مسخ ہونے لگتی ہے، اور جب تعصب انصاف پر غالب آ جائے تو معاشرے تقسیم ہو جاتے ہیں۔

اس کتاب میں کسی فرد، جماعت یا ادارے کو مطلق حق یا مطلق باطل ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ جہاں اختلاف ہے، وہاں دلیل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور جہاں تاریخ میں اختلافی روایات موجود ہیں، وہاں انہیں اختلافی ہی رہنے دیا گیا ہے۔ کیونکہ تحقیق کا تقاضا یہی ہے کہ دعوے اور حقیقت کے درمیان فرق باقی رکھا جائے۔

کشمیر صرف ایک جغرافیائی تنازع نہیں، بلکہ شناخت، تاریخ، آئین، عدل اور حقِ خود ارادیت کا سوال بھی ہے۔ اسی طرح پاکستان صرف ایک ریاست نہیں، بلکہ ایک ایسا قومی تجربہ ہے جس کی مضبوطی کا انحصار آئین کی بالادستی، اداروں کے توازن، سیاسی بلوغت اور عوامی اعتماد پر ہے۔ اور امتِ مسلمہ بھی صرف مشترک مذہبی شناخت کا نام نہیں، بلکہ عدل، رحم، دیانت اور مظلوم کی حمایت جیسی دائمی اقدار کی امین ہے۔

اگر اس کتاب کی کسی تحریر سے اختلاف پیدا ہوتا ہے تو میں اسے خوش آئند سمجھوں گا، بشرطیکہ اس اختلاف کی بنیاد دلیل، تحقیق اور علمی دیانت ہو۔ کیونکہ سوال اٹھانا علم کی ابتدا ہے، اور مکالمہ ہی معاشروں کو جمود سے نکالتا ہے۔

یہ کتاب کسی حتمی فیصلے کا دعویٰ نہیں کرتی، بلکہ ایک دعوت دیتی ہے؛ تاریخ کو دوبارہ پڑھنے کی، مروجہ بیانیوں کو پرکھنے کی، اور اپنے اجتماعی مستقبل کو جذبات کے بجائے اصولوں اور حقائق کی روشنی میں سمجھنے کی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اگر اس کتاب میں کوئی بات حق اور انصاف کے مطابق ہے تو اسے قبولیت عطا فرمائے اور اسے لوگوں کے لیے نفع کا ذریعہ بنائے، اور جہاں مجھ سے خطا یا کمی ہوئی ہو، مجھے اس کی اصلاح کی توفیق عطا فرمائے۔ بے شک انسان کی ہر کوشش محدود ہوتی ہے، جبکہ کمال صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہے۔

"رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ"
"اے ہمارے رب! ہمیں ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر، اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما، بے شک تو ہی سب سے زیادہ عطا فرمانے والا ہے۔"
(آلِ عمران: 8)

وضاحتی نوٹ

یہ کتاب کسی ایک سیاسی جماعت، نظریے، ریاستی ادارے یا شخصیت کی تائید یا تردید کے مقصد سے نہیں لکھی گئی، بلکہ دستیاب تاریخی شواہد، آئینی دستاویزات، معتبر تحقیقی مآخذ اور مصنف کے تنقیدی و تجزیاتی مطالعے کی بنیاد پر مرتب کی گئی ہے۔

جن موضوعات میں اہلِ علم اور محققین کے درمیان اختلافِ رائے موجود ہے، وہاں حتیٰ الامکان مختلف مؤقف کو پیش کرتے ہوئے متوازن، اصولی اور استدلالی انداز اختیار کیا گیا ہے، تاکہ قاری جذبات یا تعصبات کے بجائے شواہد، دلائل اور تاریخی حقائق کی روشنی میں اپنی رائے قائم کر سکے۔

مصنف کا مقصود کسی فرد، جماعت یا ادارے پر فیصلہ صادر کرنا نہیں، بلکہ سنجیدہ علمی مکالمے، فکری دیانت، آئینی شعور اور تاریخی تحقیق کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ اگر یہ کتاب قاری کو مسلمہ بیانیوں پر ازسرِ نو غور کرنے، اختلاف کو برداشت کرنے اور دلیل کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کی ترغیب دے سکے، تو یہی اس کی اصل کامیابی ہوگی۔

زاہد اقبال فاروقی

حوالہ جات

قرآن و حدیث

قرآن مجید

صحیح البخاری

صحیح مسلم

سنن ابی داؤد

جامع الترمذی

مسند احمد

آئینی و سرکاری دستاویزات

آزاد جموں و کشمیر عبوری آئین، 1974ء

آزاد جموں و کشمیر سپریم کورٹ کے متعلقہ فیصلے (خصوصاً مہاجر نشستوں سے متعلق)

حکومتِ آزاد جموں و کشمیر کے انتخابی قوانین اور متعلقہ قانونی دستاویزات

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی کشمیر سے متعلق قراردادیں (1948–1957)

پاکستان کا آئین (متعلقہ دفعات)

تاریخی و تحقیقی کتب

الیسٹر لیمب (Alastair Lamb)، Kashmir: A Disputed Legacy

جوزف کوربل (Josef Korbel)، Danger in Kashmir

وکٹوریہ اسکوفیلڈ (Victoria Schofield)، Kashmir in Conflict

کرسٹوفر اسنیڈن (Christopher Snedden)، Understanding Kashmir and Kashmiris

مارٹن سوکیفیلڈ (Martin Sökefeld)، Redefining Kashmir

راجر بالارڈ (Roger Ballard)، میرپوری ہجرت اور برطانوی کشمیری کمیونٹی پر تحقیقی مقالات

ایان ٹالبوٹ (Ian Talbot)، برصغیر اور تقسیمِ ہند سے متعلق تحقیقات

ویرٹی سیف اللہ خان (Verity Saifullah Khan)، میرپور اور منگلا ڈیم سے متعلق مطالعات

پاکستان کی سیاسی و عسکری تاریخ

حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ

صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز، یہ خاموشی کہاں تک؟

حسن عسکری رضوی، Military, State and Society in Pakistan

ڈاکٹر عائشہ صدیقہ، Military Inc.

اسلامی فکر و سیاسیات

سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی ریاست

سید ابوالاعلیٰ مودودی، خلافت و ملوکیت

سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی دستور کی تدوین

سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن

خورشید احمد، اسلامی ریاست اور اسلامی تحریک سے متعلق تصانیف

خرم مراد، لمحات

جماعت اسلامی کے بنیادی مآخذ

دستور جماعت اسلامی پاکستان

دستور جماعت اسلامی آزاد جموں و کشمیر

دستور جماعت اسلامی جموں و کشمیر

جماعت اسلامی کے منشورات اور انتخابی دستاویزات

اخبارات، جرائد اور دیگر ذرائع

ڈان (Dawn)

دی نیوز انٹرنیشنل

بی بی سی اردو ، الجزیرہ ، رائٹرز

اقوام متحدہ کی سرکاری ویب سائٹ اور متعلقہ دستاویزات

پاکستان اور آزاد جموں و کشمیر کے سرکاری ریکارڈ

مصنف کا تعارف

راقم نے ابتدائی تعلیم کے بعد 1992ء میں مرکز علوم اسلامیہ، منصورہ لاہور میں درسِ نظامی کی تعلیم کا آغاز کیا۔ دورانِ تعلیم فکری و تربیتی مراحل سے گزرنے کے بعد تحریکِ کشمیر کے عملی مرحلے سے بھی وابستگی رہی۔ 1996ء میں عسکری تربیت حاصل کی اور بعد ازاں عسکری تربیت گاہ میں استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 1998ء سے 2005ء کے دوران ریاست جموں و کشمیر کے مختلف علاقوں، سرحدی خطوں اور بیس کیمپوں میں مختلف ذمہ داریاں ادا کیں۔ اس عرصے میں متعدد اہم واقعات کا عینی مشاہدہ کیا، عملی جدوجہد کے مختلف پہلوؤں کو قریب سے دیکھا اور دورانِ ذمہ داری مشکلات و آزمائشوں کا سامنا بھی کیا۔

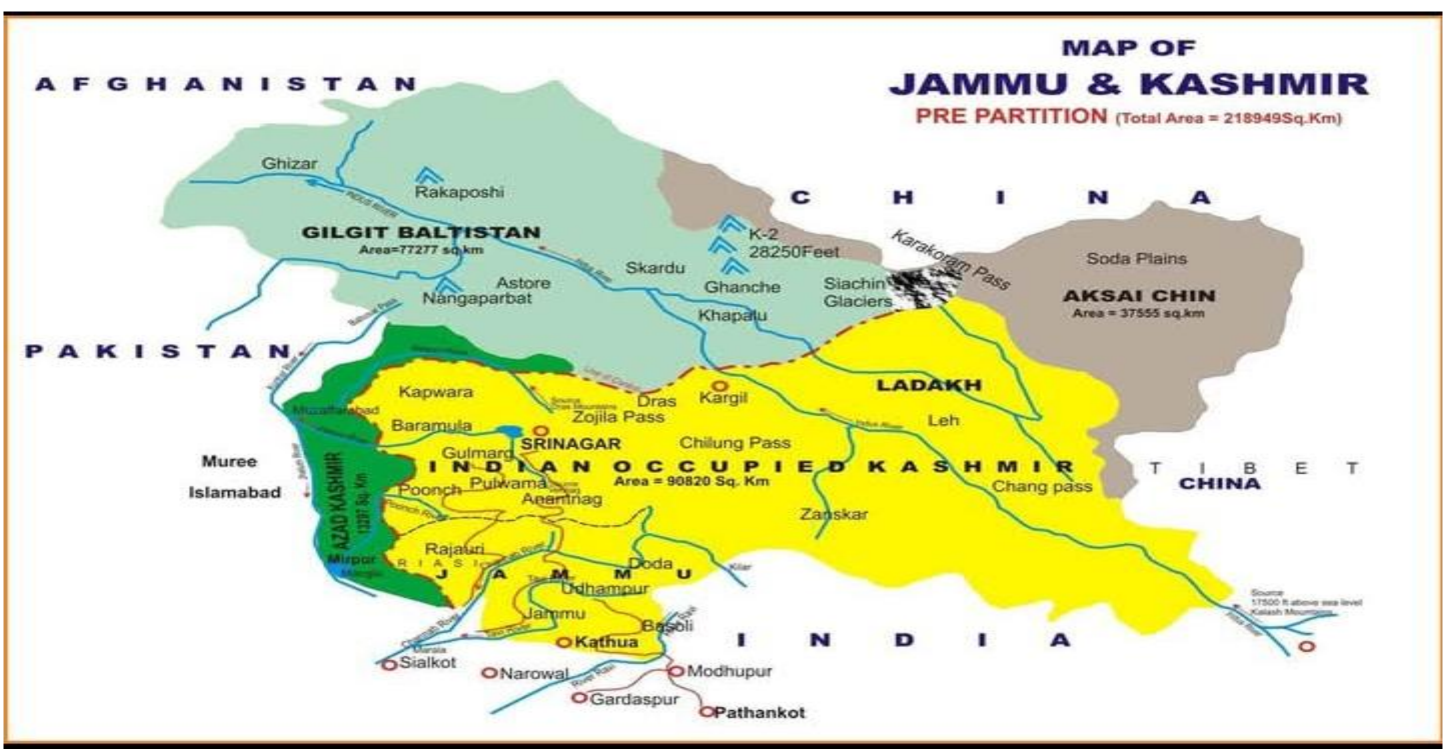
بعد ازاں عملی میدان سے کنارہ کش ہونے کے بعد مطالعہ، تحقیق اور تحریر کو اپنی علمی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ کشمیر کی تاریخ، سیاست، آئینی ارتقا، مہاجرینِ جموں و کشمیر کے مسائل، علاقائی حالات اور ریاستی و فکری موضوعات پر تحقیقی و تجزیاتی انداز میں لکھتے رہے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب **"کشمیر: نعروں سے حقیقت تک "**انہی مطالعات، مشاہدات اور فکری مباحث کا حاصل ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے محض جذباتی وابستگی یا روایتی بیانیوں کے بجائے تاریخی شواہد، سیاسی حقائق، آئینی پہلوؤں اور زمینی تجربات کی روشنی میں کشمیر کے مسئلے کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

کتاب کا بنیادی مقصد کشمیر سے متعلق رائج نعروں، دعوؤں اور تصورات کو حقیقت کے آئینے میں پرکھنا، ماضی کے فیصلوں، موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانات پر سنجیدہ غور و فکر کی دعوت دینا ہے۔ مصنف نے اپنے ذاتی مشاہدات، طویل مطالعے اور مختلف ادوار کے تجربات کو بنیاد بناتے ہوئے اس موضوع کے پیچیدہ پہلوؤں کو متوازن اور تحقیقی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ کتاب ان قارئین کے لیے ایک فکری دستاویز ہے جو کشمیر کے مسئلے کو تاریخی پس منظر، سیاسی ارتقا اور زمینی حقائق کے ساتھ سمجھنا چاہتے ہیں۔

زاہد اقبال فاروقی





"سید علی گیلانی کے تاریخی الفاظ"

اسلام کی نسبت سے

ہم مسلمان ہیں اور مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں،
درد ایک کو ہوتا ہے تو اثر سب پر ہوتا ہے۔
کشمیر کا پاکستان سے رشتہ صرف جغرافیہ کا نہیں،
یہ ہمارے ایمان، ہماری عقیدت اور ہماری مسلم شناخت کا حصہ ہے۔

اسلام کے تعلق سے

ہماری جدوجہد، ہمارا مزاحمتی جذبہ اور ہماری تحریک
اسلامی اصولوں اور تعلیمات سے ماخوذ ہے۔
ہم ظلم کے خلاف کھڑے ہیں اور عدل و انصاف کے قیام کے لیے
اسلام ہمیں یہ درس دیتا ہے۔

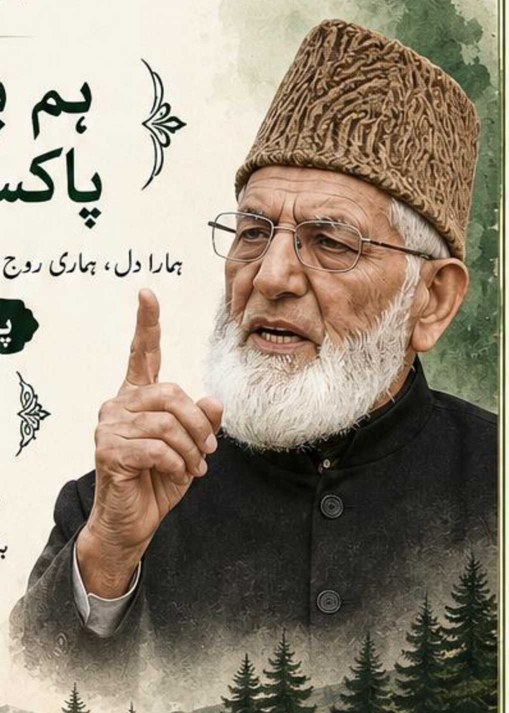
ہم پاکستانی ہیں پاکستان ہمارا ہے

ہمارا دل، ہماری روج، ہماری امیدیں اور ہمارا مستقبل پاکستان کے ساتھ جڑا ہے۔

پاکستان سے رشتہ کیا؟

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ

یہی رشتہ ہمارا ایمان ہے، یہی ہماری پہچان ہے،
یہی ہماری وحدت ہے، اور یہی ہماری بقا کی ضمانت ہے۔



کشمیر پاکستان کی شم رگ ہے
کشمیر پاکستان کا ہے اور رہے گا۔

کشمیر:

نعروں سے حقیقت تک

کشمیر صرف ایک جغرافیائی تنازع نہیں بلکہ تاریخ، شناخت، آئین، سیاست اور عوامی امنگوں سے جڑا ایک پیچیدہ سوال ہے۔ اس موضوع پر لکھی جانے والی بیشتر تحریریں یا تو جذبات سے مغلوب ہوتی ہیں یا سیاسی وابستگیوں کے زیر اثر۔ زیر نظر کتاب ان دونوں انتہاؤں سے ہٹ کر تاریخی شواہد، آئینی دستاویزات اور تحقیقی مرتلع کی روشنی میں کشمیر کے اہم سیاسی، آئینی اور فکری مباحث کا تنقیدی جائزہ پیش کرتی ہے۔

کتاب میں کشمیر سے متعلق معروف نعروں مہاجرین جموں و کشمیر کی نمائندگی، آزاد کشمیر کی آئینی حیثیت، پاکستان میں سیاسی انجینئرنگ، ریاستی اداروں کے کردار، اور وسیع تر مسلم سیاسی تناظر جیسے موضوعات کو متوازن اور استدلالی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ قاری جذبات کے بجائے دلیل اور تحقیق کی بنیاد پر اپنی رائے قائم کر سکے۔

مصنف



زاہداقبال فاروقی

زاہد اقبال فاروقی نے سے 1995ء تک مرکز علوم اسلامیہ، منصورہ لاہور میں درس نظامی کی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں تحریک کشمیر کے مختلف عملی مراحل، سرحدی علاقوں اور بیس کیمپوں میں ذمہ داریاں ادا کیں اور ریاست جموں و کشمیر کے حالات کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ عملی میدان سے وابستگی کے بعد انہوں نے مطالعہ، تحقیق اور تصنیف کو اپنی علمی سرگرمی کا مرکز بنایا۔ ان کی تحریروں کا بنیادی موضوع کشمیر کی تاریخ، سیاست، آئینی ارتقا، قومی شناخت اور ریاستی مسائل ہیں۔ زیر نظر کتاب انہی موضوعات پر ان کے تحقیقی اور تجزیاتی مطالعے کا حاصل ہے۔

رابطہ

موبائل: +966 55 915 4307
واٹس ایپ: +92 300 5513597
ای میل: zifarooqi@gmail.com
فیس بک: facebook.com/zifarooqi75

ISBN 978-969-23675-1-7